منکرات رمضان

مصنف

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی

(بانی و مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور)

شعبۂ تحقیق واشاعت

Jamia Islamia Maseehul Uloom, Bangalore

K.S. Halli, Post Kannur Village, Bidara Halli Hobli, Baglur Main Road, Bangalore - 562149

H.O # 84, Armstrong Road, Mohalla Baidwadi, Bharthi Nagar, Bangalore - 560 001

Mobile : 9916510036 / 9036701512 / 9036708149

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک ضروری گزارش!

معزز قارئینِ کرام! اس کتاب کو عام قاری کے مطالعہ، اُمتِ مسلمہ کی راہنمائی اور ثوابِ دارین کے خاطر پاکستان ورچوئل لائبریری پر شائع کر رہا ہوں۔ اگر آپ کو میری یہ کاوش پسند آئی ہے یا آپ کو اس کتاب کے مطالعے سے کوئی راہنمائی ملی ہے تو برائے مہربانی میرے اور میرے والدین کی بخشش کے لئے اللہ رب العزت سے دُعا ضرور کیجئے گا۔ شکریہ

طالبِ دُعا سعید خان

ایڈمن پاکستان ورچوئل لائبریری

منکرات رمضان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ

حضرت مولانا مہربان علی صاحب نانوتوی عمت فیوضہم

استاذ مدرسہ عربیہ امداد العلوم ہرسولی مظفر نگر

نحمدہ ونصلی علی رسول الاکرم:

اسلام کی پاکیزہ تعلیمات اور صاف ستھرے ماحول پر منکرات ومحدثات کا گرد وغبار بھی آ کر کبھی کبھی گرتا رہتا ہے، اگر اس کو اہل علم اپنی خداداد صلاحیت اور دینی علم کی حرارت سے دور نہ کرتے رہیں تو وہ رفتہ رفتہ تہ بتہ جم کر غلاف کی حیثیت لے لیتا ہے اور دینِ حنیف کی اصلی صورت پوشیدہ کرنیکی کوشش کرتا ہے۔

ماہ مبارک رمضان شریف میں بھی کچھ خود ایجاد باتیں تقریباً ہر جگہ پیدا ہوگئی ہیں، جن سے اصلی دین کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے، واعظین، خطباء اور اصحاب قلم کا فریضہ ہے کہ بلاخوف لومۃ لائم امت کو صراط مستقیم سے آگاہ کرتے رہیں اور ''بھیڑ کی صورت میں بھیڑیے'' کو پنپنے کا موقعہ نہ دیں۔

اللہ تعالی جزائے خیر عطا فرمائیں مؤلف سلمہ کو کہ انھوں نے جس طرح دیگر بدعات وخرافات پر قلم اٹھایا اور کامیابی سے ہم کنار ہوگئے، رمضان المبارک کے منکرات پر بھی خاصا اور اہم مواد جمع کر دیا۔

میں نے اس کا مسودہ اول سے آخر تک دیکھا ہے، سب مدلل اور محول ہے۔ حق تعالی اس رسالہ سے امت کو مسلمہ انصاف کی نظر سے دیکھکر استفادہ کی توفیق سے نوازیں اور مولانا کے زور قلم میں ترقی عطا فرمائیں۔ فقط

۱۰/رجب ۱۴۱۲ھ

احقر مہربان علی بڑوتوی

(مدرسہ عربیہ امداد الاسلام ہرسولی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچۂ مؤلف

اسلام دشمن عناصر یا جاہل و بے دین لوگوں نے دین وشریعت میں جو رخنہ اندازیاں کی ہیں، ان میں سب سے کامیاب وہ ہیں جو دین کے نام پر بدعات وخرافات کی شکل میں ہوئی ہیں۔ان بدعات نے دین کا اصلی وحقیقی حلیہ ہی نہایت بے دردی کے ساتھ بگاڑ کر رکھدیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ان تمام بدعات وخرافات کے پلندے کے ساتھ کسی غیر مسلم کے سامنے دین کو پیش کیا جائے تو بلا شبہ وہ قطعاً اس سے متاثر نہ ہوگا، جبکہ اصلی وحقیقی دین وہ عجیب التاثیر وکیمیا اثر شئی ہے جو سب ہی کو متاثر کر دیتا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ کوئی قبول کرتا ہے،کوئی عناد وتعصب سے قبول نہیں کرتا ہے۔

اور یہ بدعات وخرافات جن کو دین کا لیبل لگا کر پیش کیا جاتا ہے،ان سے کون سا شعبۂ دین خالی ہے؟ ہر شعبہ وہر باب میں ان کو داخل کرنے والوں نے داخل کر کے دین اسلام کے اصلی چہرے کو بگاڑنے کی کوشش کی ہے، انہی میں سے وہ بدعات بھی ہیں جو رمضان اور عید کے موقعہ پر اپنائے جاتے ہیں۔زیر نظر رسالہ میں احقر نے ان بدعات ورسومات پر شرعی دلائل سے مفصل کلام کیا ہے جو رمضان اور عید سے تعلق رکھتی ہیں۔

اس رسالہ کی ترتیب وتالیف کا داعیہ حضرت نبی کریم ﷺ کی اس حدیث سے پیدا ہوا جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

’’جب میری امت میں بدعتیں پیدا ہو جائیں اور میرے صحابہ کو برا کہا جانے لگے تو عالم کو چاہئے کہ وہ اپنا علم ظاہر کرے جو ایسا نہ کرے گا اس پر خدا اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔‘‘(۱)

---

(۱)الصواعق المحرقہ:۲/

خیال ہوا کہ اپنی مقدور بھر کوشش سے رمضان وعید سے متعلق غیر شرعی امور ورسوم کی تردید کردوں کہ رمضان جیسے مبارک مہینہ میں اور عید جیسی نعمت کے موقعہ پر ان سے اجتناب کیا جائے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالی مقبول ومفید بنائے، ناظرین سے گزارش ہے کہ اپنی نیک دعاؤں میں فراموش نہ کریں، اور سہو وغلطی دیکھیں تو مطلع فرما کر ماجور ہوں۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان مفتاحی

خادم مدرسہ مسیح العلوم

۳۰ رشعبان ۱۴۱۱ھ

تراویح پر اجرت کا مسئلہ

آج کل تراویح میں قرآن سنانے پر اجرت لینے دینے کا رواج عام ہو گیا ہے اور اب یہ رسم اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ اس معاملے کو برا تو کیا مستحسن و محبوب سمجھا جانے لگا ہے، حالانکہ یہ ناجائز اور قبیح رسم ہے؛ کیونکہ عبادت پر اجرت لینے دینے کو شریعت اسلامیہ نے ناجائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں مثلاً:

(۱) حضرت ابودرداءؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

"مَنْ اَخَذَقَوْساًعَلٰی تَعْلِیْمِ الْقُرْآنِ قَلَّدَهُ اللّٰهُ قَوْساً مِّنْ نَارٍ"

جو شخص قرآن کی تعلیم پر (بطور اجرت) کمان لے تو اللہ تعالی اس کے گلے میں آگ کی کمان ڈالیگا۔ (۱)

اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں سوائے عبدالرحمٰن بن یحیی کے۔ بیہقی نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے، مگر ابوحاتم، ابن حبان جیسے ائمہ حدیث نے ان کی توثیق کی ہے۔ (۲) لہٰذا یہ روایت حسن ہوگی۔

(۲) حضرت بریدہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

"مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ یَتَأَکَّلُ بِهِ النَّاسَ جَاءَ یَوْمَ الْقِیَامَةِوَوَجْهُهُ عَظْمٌ لَیْسَ عَلَیْهِ لَحْمٌ"

(جو شخص اس لیے قرآن پڑھتا ہے کہ اس کے ذریعے سے لوگوں سے لیکر کھائے تو قیامت میں اس کو اس حال میں لایا جائے گا کہ اس کا چہرہ صرف ہڈی ہی ہڈی ہوگا، اس پر گوشت نہ ہوگا) (۳)

(۳) امام احمد اسحاق ابن ابی شیبہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت عبدالرحمٰن بن شبلیؓ سے

---

(۱) اعلاء السنن: ۱۶/۱۶۶ (۲) دیکھو تہذیب التہذیب: ۶/۲۹۴ (۳) شعب الایمان: ۲/۵۳۲

روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قرآن پڑھو اور اس کے ذریعہ مت کھاؤ۔ (۱)

ان روایات اور اس معنی کی دیگر روایات کے پیش نظر فقہاء احناف نے عبادات پر اجرت کو ناجائز قرار دیا ہے. چنانچہ صاحب ھدایہ فرماتے ہیں:

" والاصل عندناان کل طاعة یختص بهاالمسلم لایجوز الاستیجا رعلیه."(۲)

(ہمارے نزدیک اصل یہ ہے کہ ہر وہ عبادت جو مسلمان کے ساتھ خاص ہے، اس پر اجرت لینا دینا ناجائز ہے)۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب "شرح وقایہ" میں ہے:

"والاصل عندنا انه لا یجوز الاجارة علی الطاعات ولاعلی المعاصی."(۳)

(ہمارے نزدیک اصل یہ ہے کہ عبادات اور معاصی پر اجارہ جائز نہیں)

ان عبارات سے ثابت ہوا کہ اصل وظاہر مذہب میں عبادات وطاعات پر اجرت لینا دینا جائز نہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ تراویح اور اس میں تلاوت کلام اللہ دونوں عبادات ہیں، لہٰذا اس پر بھی اجرت لینا دینا جائز نہ ہوگا۔ چنانچہ اکابر علماء وفقہاء نے اسکو صاف وصریح الفاظ میں ناجائز قرار دیا ہے۔

ہم یہاں چند اکابر کے فتاوی نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ مذکورہ بالا دلائل کی بنا پر حضراتِ علماء نے تراویح اور ختم قرآن پر اجرت کو ناجائز قرار دیا ہے:

حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے ہیں:

"رمضان شریف میں جو قرآن پاک تراویح ونوافل میں سنایا جاتا ہے، اس کی اجرت لینا دینا دونوں حرام ہیں۔ اور آمدنی مساجد سے یہ خرچ اور بھی زیادہ برا ہے،

---

(۱) الدرایۃ مع الہدایہ: ۲۸۷/۳ (۲) ہدایہ: ۲۸۷/۳ (۳) شرح وقایہ: ۲۹۹

بلکہ متولی پر اس کا ضمان آئے گا''۔ (۱)

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ایک طویل فتوی کے آخر میں فرمایا ہے:

''حاصل جواب یہ ہوا کہ رواج مذکور فی السوال (یعنی حافظ کو دینے کا رواج) محض باطل اور مخالف شرع ہے۔ اور ایسا ختم ہرگز موجب ثواب نہیں؛ بلکہ موجب معصیت ہے''۔ (۲)

مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ فرماتے ہیں:

''اجرت دینا اور لینا قرآن کریم کے سننے اور پڑھنے کے لیے جائز نہیں اور اس میں کسی کو ثواب نہیں ملتا، نہ پڑھنے والے کو، نہ سننے والے کو اور سنتِ ختم قرآن اس طرح پر ادا نہیں ہوتی''۔ (۳)

مولانا شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں:

''تراویح میں ختم قرآن پر اجرت مقرر کر لینا خواہ صراحۃً ہو، جیسا کہ بعض لوگ کرتے ہیں یا بطورِ عرف وعادت ہو جیسا کہ عموماً آج کل رائج ہے، دونوں صورتوں میں جائز نہیں''۔ (۴)

حضرت مولانا محمود حسن گنگوہی دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

''اجرت مقرر کر کے امام کو تراویح کے لئے بلانا مکروہ ہے''۔ (۵)

ان تمام عبارات سے ثابت ہوا کہ تراویح میں ختم قرآن پر اجرت لینا اور دینا ناجائز ہے۔ اس کے علاوہ اس سلسلے میں ایک صریح روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے آئی ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے بھی اس کو ناجائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ

---

(۱) فتاوی رشیدیہ: (۲) امداد الفتاوی: ۱/۴۸۱ (۳) عزیز الفتاوی: ۲۶۳ (۴) امداد المفتین: ۳۶۳
(۵) فتاوی محمودیہ: ۲/۳۵۱

علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے ''اعلاء السنن'' میں بحوالہ ''محلی'' یہ روایت نقل کی ہے کہ:

''أَنَّ عَمَّارَابْنَ يَاسِرٍاَعْطى قَوْماًقَرءُ وْالْقُرْآنَ فِى رَمَضَانَ فَبَلَغَ ذٰلِكَ عُمَرَفَكَرِهَهُ فَقَالَ عُمَرُاَوَيُعْطى عَلٰى كِتَابِ اللّٰهِ ثَمَناً؟''

(حضرت عمار بن یاسرؓ نے ایسے لوگوں کو جنہوں نے رمضان میں قرآن پڑھا تھا کچھ دیا، یہ بات حضرت عمرؓ کو معلوم ہوئی تو آپ نے اسکو برا سمجھا، اور ایک روایت میں حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ کتاب اللہ پر بھی کچھ قیمت دیجاتی ہے؟(۱)

اس روایت سے یہ بات ظاہر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رمضان میں ختم قرآن پر کچھ دینے کو مکروہ و برا سمجھا، حالانکہ یہاں دینے اور لینے والے کا مقصد اجرت نہیں تھا اور نہ ہی اس کا وہاں کوئی عرف و رواج تھا۔ خیال فرمایئے کہ جہاں بطور اجرت دینا اور لینا ہوتا ہو اور اس کا رواج ہو، وہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کیا فیصلہ ہوگا؟ الغرض تراویح میں ختم قرآن پر اجرت سراسر ناجائز ہے اور اسی وجہ سے حضرات علماء نے بلا اجرت تراویح پڑھانے والے حفاظ نہ ملنے کی صورت میں غیر حافظ کے پیچھے ''الم تر کیف'' سے تراویح پڑھ لینے کا فتوی دیا ہے۔

چنانچہ مرشدی مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب دامت برکاتہم اپنی تصنیف ''تعلیمات اسلام'' میں فرماتے ہیں:

''اگر حافظ صاحب کچھ لیکر قرآن شریف سنائیں تو ہرگز نہ سنیے! بلکہ ''الم تر کیف'' سے کوئی ناظرہ خواں تراویح پڑھا دے، یہ بہتر ہے کچھ لیکر قرآن شریف سننے سنانے سے، یہ قرآن شریف کو بیچنا ہے اور یہ حرام ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے

﴿وَلَا تَشْتَرُوْا بِآيَاتِىْ ثَمَناً قَلِيْلاً﴾ (۲)

اب بحث یہ رہ جاتی ہے کہ پھر علماء و فقہاء نے پنجوقتہ نمازوں کی امامت، تعلیم

(۱) اعلاء السنن: ۱۶/۱۶۹ (۲) تعلیمات اسلام: ۲/۱۰۰

قرآن وحدیث وفقہ، اذان ووعظ وغیرہ عبادات پر اجرت کو کیوں اور کیسے جائز قرار دیا ہے؟ اوران پر اجرت اگر جائز ہے تو تراویح پر کیوں نا جائز ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرات فقہاء نے ان عبادات پر اجرت کو ضرورت شرعی کی بنا پر جائز قرار دیا ہے۔ اور وہ ضرورت یہ ہے کہ ان چیزوں پر اجرت نہ دی جائے تو یہ اہم فرائض وشعائر اسلام ضائع ہو جائیں گے۔ کیونکہ یہ روزانہ کی ضروت کی چیزیں ہیں اوران میں لگنے والے کو مستقل اوراچھا خاصا وقت قربان کرنا پڑیگا اور اپنے آپ کوان کی خاطر محبوس کرنا ہوگا۔ پس اگران حضرات کا وسیلۂ معاش کچھ نہ ہوگا تو بھلا وہ ان چیزوں کو کس طرح پورا کریں گے؟ اس لئے بضرورت شرعی اس کو جائز قرار دیا گیا۔ اس کے برخلاف تراویح فرض وواجب نہیں اور نہ ہی تراویح میں ختم قرآن فرض وواجب ہے؛ بلکہ مستحب اور زیادہ سے زیادہ سنت ہے، پھر یہ سال میں ایک ماہ کا عمل ہے اوراس ماہ میں بھی صرف تھوڑا سا وقت اس کے لئے لگتا ہے، مستقل وقت دیکر محبوس ہو جانے کی اس میں نوبت نہیں آتی، لہذا یہ شرعی ضرورت کے دائرہ سے خارج ہے۔ اس لئے اس کو اصل حکم کے مطابق حرمت کے حکم میں رکھا گیا ہے۔ اس تفصیل سے دونوں قسم کی عبادات میں فرق واضح ہو گیا۔

اس مسئلہ کی زیادہ تفصیل علماء کی عبارات کے ساتھ میرے رسالے ''رمضان اور جدید مسائل''، میں دیکھی جاسکتی ہے۔ (۱)

اس کے بعد اس سلسلے کے کچھ شبہات کا جواب دے دینا ضروری ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ختم قرآن پر دی جانے والی رقم اجرت نہیں ہدیہ ہے۔ مگر یہ سراسر غلط ہے، کیونکہ ہدیہ وہ ہوتا ہے جو بلا عوض محض طیب خاطر سے دیا جائے اوراس میں جبر واکراہ نہ ہو اور تراویح کی اجرت کے مسئلہ میں جبر واکراہ بھی ہوتا ہے اورعوض کا شبہ بھی

(۱) رمضان اور جدید مسائل: ۶۰۔۶۱

موجود ہے۔لہذا اس کو ہدیہ قرار دینا غلط ہے۔بعض فرماتے ہیں کہ اجرت مقرر کرنے اور شرط کرنے سے یہ نا جائز ہوتا ہے، اگر شرط نہ لگائے تو جائز ہے۔مگر یہ بھی صحیح نہیں، کیونکہ فقہ کا قاعدہ ہے کہ'' **المعروف کالمشروط**''(۱)

کہ جو عرف میں رائج ہو وہ مشروط کی طرح ہے۔لہذا جب تراویح پر لینے دینے کا رواج ہو گیا تو اب بلا شرط لینا بھی نا جائز ہوگا، جیسے شرط کر کے لینا نا جائز ہے

بعض نے یہ حیلہ بھی بیان کیا ہے کہ پنجوقتہ نمازوں میں سے ایک دو وقت کی امامت بھی تراویح کے ساتھ کر لے تو اجرت لینا جائز ہے۔مگر یہ بھی لغو ہے، کیونکہ کسی بھی چیز کا صحیح و غلط ہونا اس کے مقصد کے لحاظ سے ہوتا ہے اور یہاں چونکہ مقصد تراویح ہے نہ کہ امامت، اس لئے یہاں امامت کا اعتبار نہ ہوگا؛ بلکہ تراویح کا ہوگا اور تراویح پر اجرت لینا نا جائز ہے۔لہذا یہ تاویل بھی غلط ہوگئی۔

اور بعض نے کہا ہے کہ ہم اس عبادت کی اجرت نہیں لیتے ہیں؛ بلکہ اتنے وقت تک محبوس ہو جانے کا نفقہ لیتے ہیں۔مگر اس کا جواب بقول حضرت حکیم الامت تھانویؒ یہ ہے کہ:

یہ توجیہ (تاویل) حبس کی مخصوص ہے صورت ضروت کے ساتھ اور جہاں ضرورت مذکورہ نہ ہو، وہاں یہ تاویل مقبول نہ ہوگی۔ورنہ طاعت کی ایک فرد بھی باقی نہ رہے گی جس پر حرمت استیجار کا حکم کیا جائے۔(۲)

حاصل یہ ہے کہ حبس کی وجہ سے نفقہ ملنا اور اس کا جائز ہونا اس وقت ہے، جبکہ وہ کام ضروری ہو، اور تراویح اور اس میں قرآن کا ختم ضروری نہیں، لہذا یہ تاویل مقبول نہیں۔غرض یہ کہ تراویح پر اجرت نا جائز ہے، اور اس کے جواز کی کوئی تاویل وتوجیہ ممکن نہیں، لہٰذا اس سے احتراز کرنا چاہئے۔

(۱) قواعد الفقہ: ۱۲۵ (۲) امداد الفتاوی: ۱/۴۷۹

تہجد میں جماعت کا اہتمام

رمضان مبارک کی آخری راتوں میں بعض جگہ نماز تہجد کو با جماعت ادا کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے اور اس عمل کو مستحسن و پسندیدہ خیال کیا جاتا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دین و شریعت میں ایک جدید عمل اور بدعت ہے؛ کیونکہ دور رسالت وصحابہ میں تہجد کو جماعت سے پڑھنے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، حالانکہ فضیلت اور ثواب حاصل کرنے میں رسول کریم ﷺ اور حضرات صحابہ سب سے آگے ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ متعدد احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نفل نماز گھر میں گذارنا افضل ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جو نماز گھر میں گذاری جاتی ہے، اس میں اصل اخفاء وافراد ہے یعنی تنہا گذارنا ہے، لہذا نوافل کو جماعت سے پڑھنا ان احادیث کے خلاف ہوگا. مثلا:

(۱) حضرت زید بن ثابتؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ’’صَلُّوْا اَیُّھَاالنَّاسُ فِي بُیُوْتِکُمْ فَاِنَّ اَفْضَلَ الصَّلٰوۃِ صَلٰوۃُ الْمَرْءِ فِي بَیْتِہٖ اِلَّا الْمَکْتُوْبَۃ.‘‘ (اے لوگو! اپنے گھروں میں نماز پڑھو؛ کیونکہ سب سے افضل نماز آدمی کی وہ ہے جو گھر میں ہو، سوائے فرض کے) (۱)

(۲) حضرت عبداللہ ابن سعدؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے گھر میں نماز پڑھنے اور مسجد میں نماز پڑھنے کے بارے میں سوال کیا، آپ نے فرمایا کہ ’’قَدْ تَرٰی مَا اَقْرَبُ مِنْ بَیْتِيْ مِنَ الْمَسْجِدِ فَلَاَنْ اُصَلِّيَ فِيْ بَیْتِيْ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ اُصَلِّيَ فِي الْمَسْجِدِ اِلَّا اَنْ تَکُوْنَ صَلٰوۃُ الْمَکْتُوْبَۃِ‘‘

(تم دیکھتے ہو کہ میرا گھر مسجد سے کس قدر قریب ہے، پھر بھی میں گھر میں نماز پڑھنے کو مسجد میں نماز پڑھنے سے زیادہ محبوب رکھتا ہوں، مگر یہ کہ فرض نماز ہو۔ (۲)

ان احادیث سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ نفل نماز مسجد کے بجائے گھر میں

(۱) رواہ النسائی بسند جید وابن خزیمہ اعلاء السنن: ۷/۷۷ (۲) شرح معانی الآثار: ۱/۱۶۷

گذارنا افضل ہے، وہیں یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جماعت فرض نماز کے ساتھ مخصوص ہے اور نفل میں اصل اخفاء اور انفراد ہے؛ کیونکہ جو نماز اجتماع کے ساتھ ادا کرنا مشروع ہے، اس کا مسجد میں گذارنا افضل ہے۔ معلوم ہوا کہ جس کو گھر میں پڑھنا افضل ہے، اس میں جماعت نہیں ہے، لہذا غیر مشروع طریقہ پر نماز ادا کرنا مکروہ ہے۔ البتہ کبھی کبھی صرف دو یا زیادہ سے زیادہ تین آدمی بلا اعلان وتداعی کے جماعت سے نفل نماز ادا کرلیں تو فقہاء نے جائز لکھا ہے۔ باقی جماعت کثیر کے ساتھ اعلان وتداعی کے ساتھ باہتمام وانتظام پڑھنا بلاشبہ بدعت ہے۔

علامہ شامی نے لکھا ہے:

ظاہر یہی ہے کہ نفل نماز میں جماعت غیر مستحب ہے۔ پھر اگر کبھی کبھی اتفاقاً کرلی جائے تو مباح ہوگا (مستحب نہیں) اور اگر اس کو پابندی سے کیا تو یہ بدعت مکروہہ ہے؛ کیونکہ یہ متوارث طریقہ کے خلاف ہے۔ (۱)

حضرات علماء دیوبند نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے اور تبلیغی جماعت کے اکابر علماء کا بھی یہی مسلک ہے۔ چنانچہ رئیس التبلیغ حضرت اقدس مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلویؒ اپنی مایہ ناز تصنیف ''امانی الاحبار شرح معانی الآثار'' میں فرماتے ہیں:

درمختار میں ہے کہ رمضان کی وتر میں (جماعت) مستحب ہے۔ اور رمضان کے علاوہ دوسرے دنوں کی وتر میں اور نفل نماز میں تداعی کے ساتھ (جماعت) مکروہ ہے۔ (۲)

اس عبارت میں رمضان کے علاوہ کے الفاظ کا تعلق صرف وتر سے ہے، نفل سے نہیں جیسا کہ اس کی عربی عبارت سے ظاہر ہے۔ اہل علم کے لئے حضرت جیؒ کی عربی عبارت بھی درج کرتا ہوں. اور وہ یہ ہے:

(۱) ردالمحتار مع درمختار: ۲/۴۸ (۲) امانی الاحبار: ۴/۲۷۷

" قال فی الدر وفی وتر رمضان مستحبة ' وفی وتر غیر ہ و تطوع علی سبیل اللہ التداعی مکروھة "اس میں ظاہر ہے کہ" غیرہ" رمضان کے علاوہ" کا تعلق صرف وتر سے کیا گیا ہے،تطوع (نفل) سے نہیں، بلکہ نفل کو الگ ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب علیہ الرحمہ" لامع الدراری" کے حاشیہ میں فرماتے ہیں:

"میں کہتا ہوں کہ اس مسئلہ (جماعت نفل) پر علامہ ابن عابد بن شامی نے تفصیل سے کلام کیا ہے .اور خلاصۃ الفتاوی سے نقل کیا ہے کہ یہ (نفل کی جماعت) اگر کبھی اتفاقاً ہو تو جائز ہے،مکروہ نہیں اور اگر اس پر پابندی کریں تو بدعت مکروہہ ہے؛ کیونکہ یہ متوارث طریقہ کے خلاف ہے"۔(۱)

ہم نے یہاں اکابر وعلماء اور تبلیغی جماعت کے سر پرست علماء میں سے دو جلیل القدر ہستیوں کو پیش کیا ہے،جنہوں نے نفل کی جماعت کا اہتمام اور اس پر پابندی کو مکروہ و بدعت قرار دیا ہے۔

اسی طرح بریلوی مسلک کے مشہور و مستند عالم مولانا محمد امجد علی اعظمی رضوی صاحب نے اپنی مشہور کتاب"بہار شریعت" میں لکھا ہے کہ:

"نوافل میں اور علاوہ رمضان کے وتر میں اگر تداعی کے طور پر ہو تو (جماعت) مکروہ ہے اور تداعی کے یہ معنی ہیں کہ تین سے زیادہ مقتدی ہوں "۔ (۲)

اگر کسی کو مزید علماء وائمہ کے فتاوی دیکھنے کا شوق ہو تو وہ ہمارا رسالہ" جماعت تہجد کا شرعی حکم" ملاحظہ کرے۔اس میں ہم نے جماعت تہجد کا مکروہ و بدعت ہونا احادیث اور فقہ وفتاوی کی روشنی میں ثابت کیا ہے اور قدیم وجدید فقہاء کی عبارات کو مع

(۱) حاشیۃ لامع الدراری:۱/۹۵ (۲) بہار شریعت:۳/۹۷

حوالہ اس میں جمع کر دیا ہے۔ یہاں اسی سے صرف ایک فتویٰ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کا نقل کرتا ہوں، آپ اپنے مکتوبات میں فرماتے ہیں کہ:

''افسوس ہزار افسوس کہ بعض وہ بدعتیں جو دوسرے سلسلوں میں قطعاً نہیں ہیں، ہمارے طریقۂ علیّہ (نقشبندیہ) میں پیدا ہو گئیں ہیں، نماز تہجد کو جماعت سے ادا کرتے ہیں، اطراف واکناف سے لوگ جمع ہوتے ہیں اور بڑی جمعیتِ خاطر کے ساتھ نماز تہجد ادا کرتے ہیں، حالانکہ یہ عمل مکروہ تحریمی ہے۔ بعض فقہاء نے جن کے نزدیک کراہت کی شرط تداعی (ایک دوسرے کو بلانا) ہے اور نفل کی جماعت کو مسجد کے ایک کونے میں جائز قرار دیتے ہیں، وہ بھی تین آدمیوں سے زیادہ کی جماعت کو باتفاق مکروہ کہتے ہیں۔ (۱)

اس مکتوب میں امام ربانیؒ نے تہجد کی جماعت کو بدعت اور مکروہ تحریمی صریح الفاظ میں لکھ کر اس رسم پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ پھر یہ بھی بتایا ہے کہ جن فقہاء نے اس کو بلا اعلان جائز کہا ہے، وہ بھی صرف تین آدمیوں تک کی جماعت کو جائز کہتے ہیں، اس سے زائد باتفاق مکروہ ہے۔

یہاں تک پہونچنے کے بعد امام احمد علیہ الرحمہ کے اتباع میں سے علامہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے کئی فتاوی نظر سے گذرے، تو ان میں سے بھی ایک فتویٰ نقل کرنا مناسب معلوم ہوا، ایک تو اس لیے کہ اس سے امام احمد کا مسلک معلوم ہو جائے گا، دوسرے اس وجہ سے کہ بہت لوگ کعبۃ اللہ میں جماعت تہجد ہونے کا ذکر کرتے ہیں (جس کی احقر کو تحقیق نہیں) اور علامہ ابن تیمیہ کو اہل عرب (سعودی والے) سب سے زیادہ مانتے ہیں اور ان کے فتاوی کی (۳۵) جلدیں خادم الحرمین شاہ فہد نے اپنے اہتمام سے طبع کرائی ہیں، تو اس کو پیش کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ اگر اہل

(۱) مکتوبات امام ربانی، مکتوب نمبر ۱۳۱ دفتر اول

عرب بھی جماعت کا اہتمام کرتے ہیں تو یہ خود ان کے امام ابن تیمیہ کے فتوی کی وجہ سے غلط ہے۔

علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

باجماعت نفل نماز کی دو قسمیں ہیں، ایک یہ کہ اس کے لیے جماعت سنت ہے جیسے نماز کسوف، نماز استسقاء اور تراویح میں، پس یہ قسم وہ ہے جو ہمیشہ جماعت سے ادا کی جائیگی جیسا کہ سنت میں آیا ہے۔ دوسری قسم وہ نفل جس کے لیے جماعت مسنون نہیں، جیسے رات کی نماز (تہجد) اور سنت مؤکدہ نمازیں اور چاشت کی نماز، اور تحیۃ المسجد وغیرہ، پس ان کو اگر کبھی کبھی جماعت سے ادا کرلیا جائے تو جائز ہے، لیکن ان میں مستقل جماعت کرنا، غیر مشروع بلکہ بدعت مکروہہ ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ و تابعین ان نمازوں کے لیے اجتماع و جماعت کی عادت نہیں رکھتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے کبھی کبھی (اتفاقا) قلیل جماعت کے ساتھ نماز نفل پڑھی ہے۔ (۱)

بعض حضرات ان تمام فتاوی وفقہ کی عبارات کو پس پشت ڈال کر، جماعت تہجد پر دلیل کے لیے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ کے عمل کو پیش کرتے ہیں کہ آپ رمضان میں تہجد جماعت سے ادا کرتے تھے، مگر غور کیجیے کہ خود حضرت مدنیؒ نے کبھی کسی کو اس کے لیے بلایا نہیں اور جب لوگوں نے آپ سے عرض کیا کہ آپ کے فعل کو لوگ حجت بنالیں گے تو فرمایا کہ میں ہی تو کرتا ہوں، کسی کو کہتا تو نہیں ہوں۔ (۲)

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کسی کو اس کے لیے کہتے نہیں تھے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے متعلق حضرت مدنیؒ کا مسلک وہی تھا جو جمہور علماء امت کا ہے۔ اگر آپ کو ان علماء سے اختلاف ہوتا تو سوال کرنے پر یہ فرماتے کہ مجھے ان علماء سے

---

(۱) مجموعہ فتاوی ابن تیمیہؒ: ۲۳/۴۱۳، ۲۳/۴۱۴ (۲) انوار الباری: ۲/۹۱

اختلاف ہے اور میرے نزدیک جماعت تہجد جائز ہے، لیکن آپ نے یہ نہیں فرمایا، لہذا ہم یا تو ان کو معذور کہیں گے یا ان کے فعل کی تاویل کریں گے کہ آپ نے خانقاہ میں رہنے والوں کی عادت کے لیے بطور اصلاح ایسا کیا ہوگا۔ مگر ان کو لیکر مستقل مسلک بنا لینا اور عوام کو اس پر جمع کرنا سراسر غلط ہے۔ حضرات علماء دیوبند بزرگوں کے تفرد کو کس نظر سے دیکھتے اور اس سے کیا برتاؤ کرتے ہیں، اس کو حضرت حکیم الامت قاری محمد طیب صاحبؒ سے سن لیجئے، فرماتے ہیں:

''ان (علماء دیوبند) کے یہاں اصل اصول اتباع سنت ہے، لیکن معمولات مشائخ بھی جس حد تک غلبۂ حال یا سکر کے دائرہ کے نہ ہوں، راہ تربیت میں بے اعتنائی و بے توجہی کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ البتہ وہ شریعت نہیں ہوتے کہ شرائع کی طرح ان کی تبلیغ وترویج کو اسٹیج کا موضوع بنا لیا جائے جس سے سنت نبوی جو اصل مقصد ہے غیر اہم ہو کر رہ جائے۔ ان کے نزدیک طرق اولیاء کی تربیتی باتیں معالجات نفس ہیں، قانون عام نہیں کہ تبلیغی انداز سے ان کا عمومی پرچار کیا جائے۔(۱)

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ حضرت مدنیؒ کا عمل غلبۂ حال یا کسی معالجۂ نفس کے لیے تھا تو وہ اپنی جگہ صحیح ہے، مگر اس کو سنت وشریعت سمجھنا اور عوام میں اس کا مظاہرہ و پرچار کرنا راہ اعتدال سے برگشتگی کی علامت ہے۔

مگر ہائے افسوس کہ آج ہمارے علاقہ میں یہ رسم و بدعت اچھے اچھے دین داروں میں بھی پھیل رہی ہے۔ ان کو علماء کے فتوے اور فقہاء کی عبارتیں اور احادیث کے مضامین دکھائے جائیں تو ان پیش کرنے والوں کو شیطان کہنے اور ان کے خلاف غلط پروپیگنڈہ کرنے اور مارنے کی دھمکیاں دینے پر اتر آتے ہیں اور بدعت مروجہ کے خلاف آواز اٹھانے کو فتنہ قرار دیتے ہیں۔ ان حضرات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ

---

(۱) علماء دیوبند کا دینی رخ:۱۳۶

ان کا شیطان کہنا، اور بدعت کے خلاف اقدام کو فتنہ قرار دینا، کیا حضرات فقہاء وعلماء تک نہیں پہنچتا؟ ضرور پہنچتا ہے، کیونکہ پیش کرنے والا تو انھیں کے فتاوی اور عبارات پیش کررہا ہے۔ اگر پیش کرنے والا مجرم ہے تو ان بدعت نوازوں کے پاس اس سے بڑے مجرم فقہاء وعلماء ہوئے۔ اب یہ لوگ فیصلہ کریں کہ کس کے خلاف لب کشائی کررہے۔ ان علماء وفقہاء میں علامہ شامی، علامہ ابن نجیم، مولانا اشرف علی تھانوی، مفتی عزاز الرحمٰن دیوبندی، مولانا عبدالشکور لکھنوی، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا ظفر احمد عثمانی، حضرت جی مولانا یوسف صاحب کاندھلوی اور حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کاندھلوی علیہم الرحمۃ اوالرضوان جیسے جلیل القدر ائمہ، فقہاء وعلماء ہیں۔ ان سب حضرات اور دوسرے حضرات کے فتاوی ہمارے رسالے ''جماعت تہجد کا شرعی حکم'' میں ملاحظہ فرمالیں۔

شبینہ نماز کا حکم:

بعض مساجد اور بعض گھروں میں شبینہ نماز کو بڑی اہمیت وحیثیت حاصل ہے اور اس کا خوب اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ فی نفسہ ایک دو یا چند راتوں میں قرآن شریف کو نماز میں ختم کرنا جائز ہے، مگر مروجہ شبینہ میں کچھ چیزیں ایسی شامل ہوگئی ہیں جن کی بنا پر مروجہ شبینہ کو حضراتِ علماء نے مکروہ قرار دیا ہے۔

(۱) منجملہ ان چیزوں کے ایک یہ ہے کہ ختم کرنے کی فکر میں قاری صاحبان قرآن مجید کو عجلت کے ساتھ پڑھتے ہیں جس سے قرآن مجید کی تلاوت صحیح نہیں ہوتی، بلکہ حروف کٹ جانے اور بے قاعدہ ادا کرنے کے سبب نہایت غلط ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ قرآن کو ایسی عجلت سے پڑھنا کہ حروف کی تصحیح وتجوید کا خیال نہ رہے، نہایت غلط اور بے ہودہ بات ہے۔

(۲) حفاظ وقراء کا اس سلسلے میں فخر ونمود کا قصد بھی اس عمل کو کراہت کے درجہ

میں لے آتا ہے۔

(۳) لمبی قرأت کی وجہ سے لوگ اس کو ایک بوجھ سمجھ کر، بے دلی و تنگدلی سے سنتے ہیں اور بعض جگہ دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ شبینہ نماز میں شروع سے شرکت نہیں کرتے، بلکہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے یا آرام کرتے بیٹھے رہتے ہیں اور جب امام رکوع میں جاتا ہے تو فوراً دوڑ کر شامل ہوجاتے ہیں۔ یہ قرآن مجید اور نماز دونوں سے لاپرواہی وغفلت بلکہ ایک طرح اعراض ہے۔

یہ سب عام مفاسد ہیں جو شبینہ نماز کے موقع پر مشاہدے میں آتے ہیں۔ پھر یہ نماز اکثر جگہ نوافل میں ہوتی ہے اور اوپر یہ بات گذر چکی ہے کہ نوافل میں جماعت مکروہ ہے، ان تمام عوارض کے ساتھ ظاہر ہے کہ اس نماز کو کراہت سے خالی کسی طرح نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ علماء نے انہی عوارض کی وجہ سے شبینہ متعارفہ کو مکروہ قرار دیا ہے۔

حضرت مولانا عبدالحی لکھنویؒ فرماتے ہیں:

''جو ختم شبینہ ہمارے زمانے میں مروج ہے، سامعین پر گراں اور بار ہوتا ہے، بعض سامعین صاحب خانہ کی طلب پر آتے ہیں، بعض دوستوں سے ملنے آتے ہیں اور کوئی ایسا نہیں جو خوشدلی سے قرآن مجید ایک رات میں سننے والا ہو، الا ماشاء اللہ اور یہ بات کراہت کا سبب ہے۔ فقہاء نے جگہ جگہ اس کی صراحت فرمائی ہے۔ علاوہ ازیں حفاظ اس قدر جلدی سے پڑھتے ہیں کہ حرکات وحروف میں خلل واقع ہوتا ہے [

حاصل یہ کہ ختم شبینہ فی نفسہ امر مستحسن ہے، لیکن چونکہ ہمارے زمانے میں مقتدیوں کی کراہت اور قرأت میں قاریوں کی عجلت کا سبب ہے، اس لئے کراہت سے خالی نہیں''۔ (۱)

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

(۱) مجموعۃ الفتاوی جلد: ۱/۱۷

”بعض حفاظ لیالی قدر میں یا کسی اور شب میں سب جمع ہو کر ایک یا کئی شخص مل کر قرآن ختم کرتے ہیں اور عرف میں اس کو شبینہ کہتے ہیں۔ اول تو بعض علماء نے ایک شب میں قرآن مجید ختم کرنے کو مکروہ کہا ہے، مگر چونکہ سلف صالحین سے ایک روز میں ختم کرنا منقول ہے، اس لیے اس میں گنجائش ہے۔ مگر اس میں اور بہت سے مفاسد شامل ہو گئے ہیں جن کی وجہ سے عمل شبینہ کا بطریق مروج ہونا بلا شک مکروہ ہے“۔ (اس کے بعد حضرت نے بالتفصیل اس کے مفاسد گنائے ہیں جن کا خلاصہ یہاں درج ہے)

(۱) تجوید و ترتیل کا خیال نہ ہونا (۲) پڑھنے والوں میں ریا و تفاخر ہونا (۳) بعض جگہ نفل میں شبینہ کا ہونا جو کہ مکروہ ہے (۴) اکثر سامعین کا اس کو گراں وبار محسوس کرنا اور آداب سماعت میں لاپرواہی کرنا بلکہ اعراض کی سی شکل بنانا وغیرہ۔ (۱)

حضرات علماء کی ان عبارات سے واضح ہو گیا کہ فی نفسہ شبینہ کے مستحسن ہونے کے باوجود اس میں شامل مفاسد اس کو مکروہ ٹھہراتے ہیں، لہذا یا تو ان مفاسد کو دور کرنا چاہئے یا اس عمل ہی کو ترک کر دینا چاہئے۔ اور اسکے مفاسد کا دور کرنا یہ ہے کہ شبینہ نماز نفل میں نہ ہو؛ بلکہ تراویح میں ہو اور حفاظ کرام قرآن کو ترتیل سے پڑھیں، ریا و فخر مقصود نہ ہو اور نہ ہی مال مقصود ہو۔ نیز سامعین کرام توجہ سے قرآن سنیں اور بے دلی و تنگدلی کا مظاہرہ نہ کریں۔

❁ رمضان کی بعض راتوں میں بے وجہ روشنی

رمضان مبارک کی بعض راتوں مثلاً پندرہویں رات، ستائیسویں رات وغیرہ میں بعض مساجد میں بے وجہ زیادہ روشنی کا اہتمام کیا جاتا ہے اور مسجد کے اندر اور باہر اور میناروں پر زائد از ضرورت لائٹوں کا انتظام کیا جاتا ہے، اس میں کئی خرابیاں ہیں۔

(۱) اصلاح الرسوم: ۱۶۶-۱۶۸

(۱) اس میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ غیر قوموں کی رسم ہے کہ وہ اپنی عیدوں اور تقریبوں میں بے وجہ روشنی کا انتظام کرتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ شریعت اسلامیہ ہر اس رسم کی بیخ کنی کرتی ہے جس میں کفار و مشرکین، یہود و نصاری سے مشابہت لازم آتی ہو۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ:

"مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ"

(جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ انہی میں سے ہے۔)(۱)

اسی طرح مختلف حدیثوں میں یہود و نصاری اور کفار کی مختلف چیزوں سے پرہیز کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ الغرض زائد از ضرورت روشنی کرنا کفار کا طریقہ ہے، لہذا اسلامی عید و تقریب کے موقع پر اس کو اپنانا سراسر ناجائز ہے۔

(۲) دوسری خرابی یہ ہے کہ اس رسم کو لوگ ایک نیک کام سمجھ کر کرتے ہیں اور جو کام شریعت میں نہ ہو اس کو دین و شریعت میں سے قرار دینا اور اس کو طاعت و عبادت خیال کرنا بدعت و احداث فی الدین ہے۔ جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے:

"مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذامَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ"

(جو کوئی ہمارے دین میں نیا کام نکالے جو اس میں نہ ہو تو وہ رد ہے)(۲)

(۳) تیسری برائی یہ ہے کہ اس میں اسراف اور فضول خرچی ہے، اور اسلام اسراف و فضول خرچی کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ مثلاً قرآن میں فرمایا گیا:

﴿وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيراً اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ الشَّيَاطِيْنِ﴾

(اور اسراف نہ کرو؛ کیونکہ اسراف کرنے والے شیاطین کے بھائی ہیں)

ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے:

(۱) ابوداؤد: ۵۵۹/۲ (۲) بخاری: ۳۷۱/۱

﴿وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ﴾ [اعراف:۳۱]

(اور اسراف نہ کرو کہ بلاشبہ اللہ تعالی اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)

ان تین وجھوں میں سے ایک بھی اگر کسی جگہ پائی جائے تو اس کے ناجائز ہونے کے لیے کافی ہے، چہ جائیکہ ان میں سے ایک نہیں؛ بلکہ کسی جگہ سب کی سب جمع ہوں، جیسے زیر بحث صورت میں تو کیا یہ ممنوع وناجائز نہ قرار دیا جائیگا؟

اس کے باوجود بعض لوگوں نے اس عمل کو جائز بلکہ مستحسن قرار دینے کے لیے عجیب اور بے ہودہ تاویلات سے کام لیا ہے، مثلا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس طرح روشنی کرنے سے اسلام کی شان وشوکت ظاہر ہوتی ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ خیال لغو وفضول ہے؛ کیونکہ اسلام کی شان وشوکت اسلامی احکام کی خلاف ورزی اور سیرت محمدی سے روگردانی میں نہیں ہے، بلکہ اس کی پیروی اور تابعداری میں ہے۔ اسی طرح اسلام کی شوکت مادی وفانی چیزوں سے نہیں، بلکہ روحانی چیزوں سے ہے اور وہ سوائے اطاعت وعبادت کے کچھ اور نہیں۔ حضرات صحابہ کے دور میں مساجد کی ظاہری زیب وزینت موجودہ دور کی مساجد کے لحاظ سے ایک فیصد بھی شاید نہ تھی، مگر اس کے باوجود ان کا وہ رعب وجلال اور وہ شان وشوکت تھی کہ قیصر وکسری کے عظیم محلات پوری آن بان اور ظاہری زیب وزینت کے باوجود اس سے محروم تھے، لہذا ایک مسلمان کی خواہش وجستجو خدا ورسول کے احکام کی اطاعت اور پیروی کے لیے ہونا چاہئے، نہ کہ مادی آرائش وزیبائش کیلئے۔ یہی ایک سچے مسلمان کا طغرائے امتیاز ہے۔

ختم قرآن پر مٹھائی کی رسم:

ایک بہت پرانی رسم ختم قرآن پر شیرینی تقسیم کرنے کی ہے، جس کا آج بھی بہت سی مسجدوں میں رواج واہتمام ہے۔

جہاں تک اس رسم کی ابتداء کا تعلق ہے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ بعض نیک دل

لوگوں نے قرآن مجید کے ختم پر فرحت ومسرت کے اظہار کے لیے اس کو جاری کیا ہوگا اور اس حد تک یہ بات بلا شبہ جائز ہے، بلکہ باعث ثواب بھی، مگر موجودہ دور میں اس میں چند عملی واعتقادی خرابیاں شامل ہو جانے کی بنا پر اس رسم کو علماء نے قابل ترک قرار دیا ہے۔

مثلاً لوگوں کا اس کو ضروری سمجھ لینا حتی کہ کبھی مٹھائی تقسیم نہ ہو تو لعن طعن اور ملامت کرنا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ لوگ اس رسم کو ضروری سمجھتے ہیں اور یہ بات ایک معمولی پڑھا لکھا بھی جان سکتا ہے کہ جس کام کو شریعت نے ضروری قرار نہیں دیا، اس کو ضروری سمجھنا عقیدے کی خرابی ہے۔

عام لوگوں کے اس کو ضروری سمجھنے کی بنا پر مساجد کے ذمہ دار گنجائش ہو یا نہ ہو، اس کو پورا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور بعض جگہ تو یہ غضب ہوتا ہے کہ مسجد کے مال سے یہ رسم ادا ہوتی ہے جو کہ سراسر ناجائز ہے؛ کیونکہ مسجد کا مال صرف مسجد کے مصارف واخراجات پر لگ سکتا ہے، کسی اور کام میں اس کو لگانا ناجائز ہے۔ نیز بعض جگہ اس رسم کے لیے الگ چندہ کیا جاتا ہے، جس میں بہت سے لوگ شرم کے مارے چندہ دیدیتے ہیں، دلی رضامندی وخوشی سے نہیں دیتے۔ نیز بعض لوگوں سے جبراً وصول کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ شرم سے دیا جانے والا اور جبر سے وصول ہونے والا مال جائز نہیں ہوتا، پھر اس سے جو مٹھائی لائی گئی وہ کیسے جائز ہوگی؟ پھر تقسیم کے موقع پر مساجد میں جو شور وغل اور ہنگامہ آرائی ہوتی ہے، وہ مزید برائی ہے۔ ان سب وجوہات کی بنا پر ظاہر ہے کہ یہ تقسیم شیرینی کی رسم ناجائز قرار پاتی ہے۔ اس لیے اس سے بھی احتراز لازم وضروری ہے۔

لیلۃ القدر میں مساجد میں اجتماع:

لیلۃ القدر جس کو ایک ہزار مہینوں سے زیادہ افضل وخیر کی رات قرار دیا گیا ہے، اس

میں عبادت کرنا اور زیادہ سے زیادہ ثواب کے حاصل کرنے کی تدبیر کرنا بہت اہمیت کا کام ہے اور اس کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری طور پر ذہن نشیں کر لینا چاہیئے کہ عبادت کو اسی طور طریقہ پر انجام دیا جائے جیسے شریعت نے بتایا ہے؛ کیونکہ شریعت اس سلسلے میں بڑی حساس ہے کہ اس کے بتائے ہوئے طریقے کے خلاف کوئی کام خصوصاً عبادت کا کام انجام دیا جائے۔ اگر عبادت کی مقدار متعین ہے تو اس مقدار سے گھٹانا یا بڑھانا اور اسی طرح عبادت کی کیفیت میں تغییر و تبدیل شریعت میں نا قابل برداشت جرم ہے۔ مثلاً ظہر کی مقررہ چار فرض رکعتوں میں سے ایک دو کا کم کر دینا یا اس میں اضافہ کر دینا، سراسر ناجائز اور تحریف دین کے مترادف ہے۔ اسی طرح عبادت کی کیفیت مثلاً تنہا پڑھی جانے والی نماز کو باجماعت پڑھنا یا اس کے برعکس فرض کو بلا وجہ تنہا پڑھنا شریعت کی نگاہ میں بہت بری بات ہے۔

مگر افسوس کہ بہت سے مسلمان اس بات سے یا تو ناواقف ہیں یا اس سے لاپرواہ ہیں۔ اور اسی وجہ سے لیلۃ القدر کی عبادت میں طریق سنت سے ہٹ کر خلاف شریعت و سنت طریقہ پر عبادت انجام دیتے ہیں۔ وہ یہ کہ لیلۃ القدر میں مساجد میں جمع ہو کر عبادت کرتے ہیں، جس کو علماء نے مکروہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ حنفی مسلک کے زبردست محقق ابوحنیفہ ثانی علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں:

''مستحبات میں سے یہ بھی ہے کہ رمضان کے آخری عشرہ کی راتوں، عیدین کی راتوں اور ذی الحجہ کی دس راتوں، شعبان کی پندرھویں رات شب بیداری کرے۔ مراد شب بیداری سے اس میں عبادت کرنا ہے اور ان راتوں میں سے کسی رات کو جاگنے کے لئے مساجد میں جمع ہونا مکروہ ہے۔ (۱)

علامہ حسن بن عمارۃ الشرنبلالیؒ گیارھویں صدی ہجری کے مشہور و معروف حنفی فقیہ ہیں، وہ اپنی کتاب '' نور الایضاح '' اور اس کی شرح '' مراقی الفلاح '' میں

(۱) البحر الرائق: ۵۲/۲

فرماتے ہیں:

''''مستحب ہے کہ رمضان کے آخری عشرے کی راتوں کوشب بیداری کرے، لیکن ان راتوں میں سے کسی رات میں شب بیداری کے لئے مساجد میں جمع ہونا مکروہ۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب نے ایسا نہیں کیا، لہذا اکثر علماء نے اس کو منکر قرار دیا ہے۔(۱)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ فرماتے ہیں:

''شب برات اور شب قدر وغیرہ میں مساجد کے اندر اجتماع کا اہتمام اور التزام یا خود ایک مستقل بدعت ہے، جس کی نظیر قرون مشہود لھا بالخیر میں موجود نہیں، کیسے کہا جاسکتا ہے کہ یہ اجتماع کوئی محمود چیز ہے، بلکہ مسنون اور مستحب صرف وہی ہے جو نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ علیحدہ علیحدہ اس مبارک رات میں بیدار رہ کر اپنی اپنی نوافل اور تلاوت میں مشغول رہیں۔(۲)

علماء کی ان تصریحات سے واضح طور پر ثابت ہوا کہ لیلۃ القدر وغیرہ میں مساجد میں اجتماع کا اہتمام مکروہ و بدعت ہے؛ اس لئے کہ دور رسالت وصحابہ وتابعین میں اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ ہاں البتہ بلا اہتمام کچھ آدمی مساجد میں عبادت کرنے آ گئے تو الگ بات ہے۔

لہذا طریق سنت کے مطابق ان راتوں میں مساجد کے بجائے اپنے گھروں کو عبادات سے رونق بخشیں؛ اسی لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

'' صَلُّوْا فِی بُیُوْتِکُمْ وَلَا تَتَّخِذُوْھَا قُبُوْرًا''

(اپنے گھروں میں نماز پڑھا کرو اور ان کو قبرستان نہ بناؤ)(۳)

---

(۱) نور الایضاح ص:۹۵ ومراقی الفلاح علی ھامش الطحطاوی:۲۱۹ (۲) امداد المفتیین :۲۰۹
(۳) جامع الصغیر مع فیض القدیر للمناویؒ:۱۹۹/۴

لہٰذا گھروں کو عبادات کے نور سے منور و بارونق بنانا اور برکات ورحمتوں کا اس کو مہبط بنانا چاہیئے۔ایک طرف تو دیندار لوگوں کا یہ حال کہ وہ لیلۃ القدر میں عبادت کے شوق میں خلاف سنت طریقہ کو اختیار کرتے ہیں اور دوسری طرف بعض لوگوں کا یہ وطیرہ کہ وہ لیلۃ القدر کی مبارک ساعتوں کو بازاروں کی سیر وتفریح کے لیے خاص کرتے ہیں۔اور مرد بھی،عورتیں بھی،بچے بھی،بجائے عبادت کے سیر وتفریح،خرید وفروخت کے لیے جاتے ہیں۔

بعض علاقوں میں اس منکر کا رواج ہو چلا ہے اور خاص طور پر بنگلور میں اس لعنتی منکر کو فروغ ہو گیا ہے۔

اس میں سب سے پہلے تو لیلۃ القدر کی بے قدری ہے اور اس بے قدری سے بڑھکر بھلا اور کیا محرومی ہوسکتی ہے؟ دوسرے مردوں اور عورتوں کا اختلاط واجتماع اور میلہ کی سی شکل،جس میں مڈبھیڑ بھی ہوتی ہے،کس قدر لعنت کا کام ہے۔کیا لیلۃ القدر اسی لعنت کے وصول کرنے کے لیے آتی ہے؟

افسوس کہ بعض دین کے نام پر خرافات کو جنم دینے اور پھیلانے والے اس منکر کی حمایت وتائید بلکہ تحسین کرتے ہیں اور اس پر نکیر کرنے والوں کو پریشان کرتے اور گالیاں دیتے ہیں۔

اللہ جزائے خیر دے انجمن خدام المسلمین (بنگلور کے کچھ ہمدرد ونیک دل لوگوں کی ایک انجمن جو رفاہی کاموں میں سرگرم عمل رہتی ہے) کے کارکنوں کو جنہوں نے بنگلور میں اس منکر کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس کا بیڑا اٹھایا اور اللہ کا کرم ہے کہ دو سالوں سے انجمن کی تحریک اور سعی کوشش سے یہ منکر قریب بختم ہو گیا ہے۔

ستائیسویں میں ختم قرآن کا اہتمام:

ہمارے علاقوں میں اکثر مساجد میں ستائیسویں رمضان کو تراویح میں ختم

قرآن کا اہتمام کچھ مبالغہ آمیز ہوگیا ہے کہ بعض؛ بلکہ اکثر لوگ ستائیسویں رمضان کو ختم کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور حافظ کو ہر صورت پر اسی تاریخ میں قرآن ختم کرنا ضروری ہوتا ہے، خواہ وہ بیمار ہو یا کسی عذر سے کچھ پارے رہ گئے ہوں۔ بہر حال اس کے لئے یہ تاریخ مقرر ہے، حالانکہ شرعاً یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ بعض فقہاء نے ستائیسویں تاریخ کو قرآن مجید ختم کرنا افضل و پسندیدہ بتایا ہے، مثلاً ''بحرالرائق'' اور ''ردالمحتار'' میں لکھا ہے کہ ستائیسویں رمضان کو ختم کرنا مستحب ہے۔ (۱)

مگر یہ بعض حضرات کا قول ہے، ورنہ صحیح قول یہ ہے کہ آخری شب میں ختم کرے۔ چنانچہ ''بحرالرائق'' ہی میں مذکورہ قول کے بعد لکھا ہے:

''مختارات النوازل کتاب میں ہے کہ ہر رکعت میں دس آیات پڑھے۔ اور یہی صحیح بات ہے؛ کیونکہ تراویح میں ختم کرنا سنت ہے؛ کیونکہ پورے مہینے کی رکعات کا عدد چھ سو ہے اور قرآن کی آیات چھ ہزار ہیں۔

علامہ شامی نے لکھا ہے کہ:

امام حسن بن زیاد نے امام ابوحنیفہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ہر رکعت میں دس یا کچھ کم وبیش آیات پڑھے اور یہی صحیح بات ہے؛ کیونکہ سنت یہ ہے کہ تراویح میں ایک دفعہ ختم کیا جائے اور یہ بات اسی سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اس میں سہولت بھی ہے کہ تراویح کی رکعات کا عدد پورے ماہ میں چھ سو ہے اور آیات قرآنی چھ ہزار کچھ اوپر ہیں۔ (۲)

ان دو فقہاء کرام کی عبارات سے معلوم ہوا کہ صحیح بات یہ ہے کہ آخری شب میں ختم کیا جائے اور یہی امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے اور دیگر ائمہ کا بھی یہی مسلک

---

(۱) ردالمحتار مع الدرالمختار: ۴۶/۲ (۲) شامی: ۴۶/۲

ہے چنانچہ علامہ عبدالرحمٰن الجزیری ؒ اپنی کتاب ''الفقہ علی مذاہب الاربعۃ'' میں فرماتے ہیں:

''نماز تراویح میں پورے قرآن شریف کا پڑھنا سنت ہے، بایں طور کہ اس کو ماہ رمضان کی آخری شب میں ختم کیا جائے۔ (۱)

علامہ جزیری نے اس جگہ کسی امام کا اختلاف نہیں بتایا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس مسئلہ پر تمام ائمہ متفق ہیں۔

ان تمام تصریحات سے واضح ہوا کہ آخری شب میں قرآن کا ختم کرنا مستحب ہے اور یہی ائمہ اربعہ کا مذہب ہے۔ اس کو چھوڑ کر ایک غیر ضروری امر کو ضروری سمجھنا بلا شبہ غلط بات ہے۔ پھر اگر ستائیس تاریخ میں ختم کرنا مستحب بھی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی ایسی پابندی اور اہتمام کہ اس کے خلاف کبھی نہ ہونے دیا جائے اور کسی عذر و مجبوری پر بھی اس کے خلاف کرنے کو برا خیال کیا جائے، یہ سراسر احداث فی الدین ہے۔

میرے علم میں ایسے بعض واقعات ہیں کہ ایک حافظ بیمار ہو گئے اور ستائیسویں تک ختم کرنا ان کے لئے مشکل ہو گیا تو ان صاحب کو ہٹا دیا گیا اور ایک دوسرا حافظ بلایا گیا تاکہ وہ ستائیسویں میں ختم کر دے۔ اس طرح کے جزوی واقعات سے پتہ چلتا ہے لوگ اس تاریخ کو ختم کرنا کس قدر ضروری خیال کرتے ہیں۔ یہ تو اس سلسلہ میں اعتقادی خرابی ہے۔

ایک خرابی عملی بھی ہے، وہ یہ کہ جب ستائیس تاریخ کو قرآن مجید ختم ہو جاتا ہے تو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بس اب قصہ ختم ہو گیا، اب تراویح تو الگ رہی بقیہ رمضان میں پنجوقتہ نمازیں بھی ختم کر دی جاتی ہیں۔ اس لئے لوگوں کے ذہنوں سے یہ بات نکالنا چاہیئے کہ رمضان صرف ستائیس تک ہے، اس کے بعد کچھ نہیں۔ اس کے لئے

(۱) الفقہ علی المذاہب الاربعہ: ۱/۵۴۵

ایک صورت یہ ہے کہ ستائیسویں کو ختم کرنے کے بجائے آخری شب میں ختم کیا جائے، اور غالباً مراد آخری شب سے انتیسویں (۲۹) شب ہے؛ کیونکہ تیسویں شب کا ملنا لازمی نہیں، کبھی انتیسویں تاریخ کو چاند نظر آ گیا تو تیسویں شب میسر نہیں آتی، لہذا انتیسویں شب میں ختم کرے۔

اجتماعی ذکر کی مجالس:

رمضان مبارک کی آخری راتوں میں بعض لوگ مساجد میں یا کسی اور جگہ اجتماعی طریقہ پر ذکر کی مجلسیں قائم کرتے ہیں، اس میں ایک صاحب صوفیاء کرام کے طریقہ پر ضرب کے ساتھ بلند آواز سے ذکر کرتے ہیں، پھر پوری مجلس ملکر اسی طرح ذکر کرتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اللہ کا ذکر عظیم الشان چیز ہے ''ولذکر اللہ اکبر'' اور اس کے فضائل بے شمار اور اس کے ثمرات بہت بڑے ہیں۔ مگر اس میں بھی شبہ نہ ہونا چاہئے کہ طریقۂ نبوی سے ہٹ کر عبادت انجام دینا بے سود ہے اور یہ ذکر کی مجالس طریقۂ نبوی سے ہٹ کر ہیں؛ کیونکہ:

(۱) اجتماعی طریقہ پر ذکر کرنا رسول اللہ ﷺ اور حضرات صحابہ کرام سے ثابت نہیں، حالانکہ وہ حضرات نیکیوں کی تحصیل میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اگر اس طرح اجتماعی ذکر ثواب اور نیکی کا کام ہوتا تو وہ حضرات ضرور یہ کام کرتے اور ہم تک یہ بات پہنچتی، حالانکہ اس طرح کی کوئی بات احادیث سے ثابت نہیں، بلکہ اس کے خلاف یہ ثابت ہے کہ ایسا کرنا سنت کے خلاف ہے۔ (یہ حدیث آگے آ رہی ہے)

(۲) مساجد میں آواز کو بلند کر کے ذکر کرنا، علماء و فقہاء نے ناجائز قرار دیا ہے چنانچہ ملا علی قاریؒ ''مرقات شرح مشکوۃ'' میں فرماتے ہیں:

''ہمارے بعض علماء نے بصراحت بیان کیا ہے کہ مسجد میں آواز کا بلند کرنا

اگرچہ ذکر ہی میں ہو، حرام ہے''۔(۱)

علامہ حلبی حنفی'' غنیۃ المستملی'' میں ایک بحث کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ:

''امام ابوحنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ بلند آواز سے ذکر کرنا بدعت ہے اور اللہ تعالی کے اس ارشاد کے خلاف ہے ﴿اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعاً وَّ خُفْیَةً﴾ کہ اللہ کو عاجزی و آہستگی سے پکارو۔(۲)

اس سے معلوم ہوا کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ اور علماء احناف ذکر میں جہر کو بدعت و ناجائز قرار دیتے ہیں۔مگر افسوس کہ لوگ آج اس بدعت کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں۔

اجتماعی ذکر کے اس طریقہ پر خلاف شرع ہونے کا حکم حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اب سے بہت پہلے لگا دیا ہے، چنانچہ امام دارمیؒ نے اپنی'' سنن'' میں درج کیا ہے کہ:

''حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ایک جماعت پر گذر ہوا جو مسجد میں ذکر کر رہے تھے، ایک شخص کہتا کہ سو(۱۰۰) دفعہ اللہ اکبر پڑھو، تو حلقہ نشین لوگ کنکریوں پر سو مرتبہ اللہ اکبر کہتے۔پھر وہ کہتا سو(۱۰۰) دفعہ لا الٰہ الا اللہ پڑھو، تو وہ ایسا ہی کرتے۔اسی طرح تسبیح کے لئے کہتا، وہ تسبیح پڑھتے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ تم ان کنکریوں پر کیا پڑھتے ہو؟ بتایا گیا کہ ذکر کرتے ہیں، اس پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا تم ان پر اپنے گناہ شمار کرو، تعجب ہے تم پر کہ ابھی تم میں صحابہ موجود ہیں اور ابھی تک رسول اللہ ﷺ کے کپڑے پرانے نہیں ہوئے اور آپ کے برتن نہیں ٹوٹے، تم اتنی جلدی ہلاکت میں پڑ گئے، پھر فرمایا: تم اندر میں حالات بدعت و گمراہی کا دروازہ کھولنے والے ہو۔(۳)

---

(۱) مرقات:۲/۴۷۰ (۲) غنیۃ المستملی: ۵۶۶ (۳) دارمی:۴۹۱

اس روایت کو علماء نے صحیح قرار دیا ہے۔غور فرمائیے کہ حضرت ابن مسعودؓ ان لوگوں کو جو مسجد میں اجتماعی ذکر کر رہے تھے، بدعت وگمراہی کا دروازہ کھولنے والے قرار دے رہے ہیں اور اس طریقہ کو خلاف شرع بتا رہے ہیں۔

اس سے ان حضرات کو عبرت وسبق حاصل کرنا چاہئے جو اس طرح کی مجالس کا اہتمام کرتے ہیں اور اسکو ثواب خیال کرتے ہیں، جبکہ یہ طریقہ سنت وشریعت کے خلاف ہونے کی وجہ سے بدعت میں داخل ہے۔

یہاں ایک اور بات بھی سمجھ لینے کی ہے، وہ یہ کہ ان مجالس میں ذکر کرانے والے صاحب حضرات صوفیاء کرام کے طریقہ پر ضرب وشغل بھی کرتے اور لوگوں کو کراتے ہیں، اس سلسلے میں معلوم ہونا چاہئے کہ صوفیاء کرام نے ذکر کا وہ طریقہ جو ضرب وشغل پر مشتمل ہے، ایک علاج ودوا کے طور پر تلقین کیا ہے اور بذات خود یہ طریقۂ ذکر جس میں ضرب وغیرہ ہوتا ہے، مقصود اور ثواب کی چیز نہیں ہے۔ثواب کی چیز ذکر ہے، چنانچہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ جو اپنے زمانے کے سرتاج صوفیاء بھی تھے، ایک جگہ فرماتے ہیں:

''طریق خاص ضرب نہ مقصود ہے، نہ موقوف علیہ مقصود، جس طرح بے تکلف بن جائے کافی ہے۔ (۱)

اس میں بتایا ہے کہ ضرب (جھٹکا وغیرہ) مقصود نہیں ہے۔اسی طرح ہمارے حضرت مسیح الامت مولانا مسیح اللہ خان صاحب دامت فیوضہم العالیہ اپنی کتاب ''شریعت وتصوف'' میں رقمطراز ہیں کہ:

''یہ سب طریق مقصود بالذات نہیں بلکہ صرف وسیلۂ یکسوئی ہیں، جو ایک درجہ میں شرعاً مطلوب ہے........ آگے چل کر فرماتے ہیں .... بس یہ بات خوب

(۱) انفاس عیسی:۶۳

یادرکھنے کی ہے کہ یہ کیفیات اگر مقدمۂ عبادت نہ بنائی جائیں تو پھر ان کا کچھ اجر (ثواب) نہیں اور مقاصد میں سے تو کسی حال ہیں ہی نہیں۔ (۱)

ان دونوں بزرگوں اور فن تصوف کے جلیل القدر اماموں کے بیانات سے معلوم ہوا کہ یہ ضرب وغیرہ کیفیات وطرُق مقصود نہیں ہیں۔ ہاں البتہ یکسوئی کے حصول کے لئے معین ومددگار ہونے کی وجہ سے جبکہ ان کو عبادت کا مقدمہ بنادیا جائے، یہ ایک درجہ میں مطلوب ہوجاتے ہیں۔ مگر ان کو ثواب وعبادت سمجھنا تو کسی حال میں روانہیں ہے، چنانچہ سرتاج صوفیاء حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ ''قصدالسبیل'' میں بصراحت فرماتے ہیں کہ:

''ان (تسبیحات) کو تھوڑی آواز اور ہلکی ضرب سے کریں، لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ زور سے ذکر کرنا اور ضرب لگانا خودکوئی ثواب کی بات نہیں ہے۔ ایسا اعتقاد کرنا گناہ ہے۔ (۲)

اب دیکھنا یہ ہے کہ جو حضرات عوام الناس کو لیکر صوفیاء کے طریق پر ذکر کرتے ہیں اور ضرب وشغل کراتے ہیں، یہ کوئی مستقل ومستمر عمل نہیں کہ اس طریقہ کا نفع وفائدہ ظاہر ہو، بلکہ محض رمضان کی طاق راتوں اور وہ بھی عشرۂ اخیرہ کی راتوں تک محدود ہے، تو بھلا دو چار راتوں میں اس کا کیا اثر ظاہر ہوگا ؟ پھر اس کے باوجود اس طریق پر ذکر کرانے کو محض لغو یا اعتقاد کی خرابی نہ کہیں تو اور کیا کہا جائے؟ جو مستقل طور پر اس طریق کو اختیار کرکے اسکو یکسوئی کا ذریعہ بنائے، اس کے لئے تو یہ درست ہے جیسا کہ اپنے حضرت کا ارشاد نقل کر چکا ہوں۔ مگر جو ایسا نہ ہو تو اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو کہا جائے گا کہ لغو وفضول یہ ضرب وشغل اختیار کیا جارہا ہے۔ یا یہ کہا جائے گا کہ لوگ اسکو ثواب سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ ثواب کا کام نہیں، ثواب تو ذکر میں ہے، نہ کہ اس

(۱) شریعت وتصوف: ۲۲/۲۔۲۳ (۲) تسہیل قصدالسبیل: ۱۷

طریق میں۔

حاصل یہ کہ ذکر کی مجالسِ مروجہ شرعاً بدعت کے زمرہ میں داخل ہیں، لہذا ان کو ترک کرنا چاہئے اور انفرادی طور پر ذکر کی تلقین کرنا چاہئے۔

نابالغ بچوں کو روزہ رکھوانے اور روزہ کشائی کی رسم:

شریعت مطہرہ سراپا اعتدال ہے اور افراط وتفریط سے بالکل پاک، چنانچہ اس نے نابالغ بچوں کے سلسلہ میں ہدایت کی ہے کہ اگر چہ وہ غیر مکلّف ہیں، مگر عادت ڈالنے کے لیے انہیں بچپن ہی سے عبادات کی طرف راغب کیا جائے۔ مگر بچپن سے کیا مراد ہے، اس کے بارے میں حدیث رسول سے پتہ چلتا ہے کہ سات برس سے بچہ کو عبادات میں لگا دینا چاہیے اور دس برس سے سختی کے ساتھ لگانا چاہیے، چنانچہ نماز کے سلسلے میں حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ:

''اپنی اولاد کو نماز کا حکم کرو جبکہ وہ سات سال کے ہو جائیں اور اس پر اس کو مارو جبکہ وہ دس سال کے ہو جائیں۔(۱)

علماء نے لکھا ہے کہ نماز کے مسئلہ ہی کی طرح روزہ اور دیگر احکام کا حکم ہے کہ سات سال میں بچوں کو اس میں لگا دینا چاہیے اور دس سال ہو جائیں تو مار کر لگانا چاہیے۔(۲)

مگر اتنے چھوٹے بچوں کو جو ان چیزوں کی کوئی تمیز نہیں رکھتے اور انہیں ان کی سہار نہیں ہے، ان مربیوں کو کسی درجہ میں بھی شریعت نے مکلّف و مامور نہیں کیا ہے ، اور اگر کوئی بچہ خود خوشی سے انجام دے لے، تو الگ بات ہے، مگر بڑوں کی طرف سے اس کو اس پر مجبور کرنا سراسر خلاف شریعت ہے۔ مگر کس قدر عجیب بات ہے کہ بعض لوگ نہایت کم سن اور معصوم بچوں کو روزہ رکھوانے کی رسم کرتے ہیں اور اس میں

(۱) جمع الفوائد: ۱/۴۵ (۲) شامی: ۲/۳۵۲

روزہ رکھوانے سے زیادہ روزہ کشائی کی رسم مقصود ہوتی ہے اوراس میں کئی خرابیاں ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ اس سے خواہ مخواہ ایک غیر مکلّف پر جبر ہوتا ہے، جس سے بسا اوقات نقصان کا اندیشہ بھی ہوتا ہے۔ حضرت حکیم الامت تھانویؒ ایک جگہ اسی رسم کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''مجھکو ایک جگہ کا قصہ معلوم ہے کہ اسی طرح کے ایک بچہ کو روزہ رکھوایا اور اپنی امارت اچھالنے کے لئے روزہ کشائی کا بہت زیادہ اہتمام کیا، گرمی کے بڑے اور کڑے دن تھے، عصر کے وقت تک اس نے جوں توں کرکے اس نے کھینچا، آخر طاقت طاق ہوگئی اور صبر وتواں نے جواب دیدیا، ٹھنڈے پانی کے مٹکے بھرے رکھے تھے، ان پر تر کپڑا پڑا تھا، برف گھولنے کا سامان ہورہا تھا، اس سارے سامان نے آگ بھڑکا دی، ایک ایک سے پانی کے لئے خوشامد کرتا تھا، لیکن اگر پانی دیدیتے تو روزہ کشائی کا سامان اکارت جاتا ہے، اپنا سامان بچانے کیلئے پانی کو جواب دیدیا، آخر سخت بیتاب ہوکر، دوڑکر ایک مٹکے کو جا لپٹا اور محبوب سے وصل ہوتے ہی روح نے قالب کو چھوڑ دیا، اسکی نعش زبان حال سے سراپاں تھی کہ:

''لو بھئی! تم کو تمہارسامان مبارک رہے، ہم اپنی جان تمہارے سامان پر فدا کرتے ہیں۔''(۱)

غور کیجئے کہ یہ حسرتناک انجام سوائے اس کے کہ شریعت سے اعراض کرکے محض رسم کی پابندی کی گئی اور کس وجہ سے ہے؟

(۲) روزہ کشائی کی رسم انجام دینا اور اس کے لئے بڑا لمبا چوڑا اہتمام اور اس کے خاطر لوگوں کو جمع کرنا، سراسر خلاف شریعت ہے؛ کیونکہ اس طرح کی رسم شریعت

---

(۱) اصلاح انقلاب: ۱۳۲/۱

میں ثابت نہیں۔حضرت عثمان بن العاصؓ کوایک ختنہ کی دعوت میں بلایا گیا تو آپ نے انکار کر دیا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ:

''ہم لوگ زمانۂ رسالت مآب ﷺ میں ختنوں میں نہیں جاتے تھے اور نہ ہی ہم کو اس کے لئے دعوت دی جاتی تھی۔(۱)

صحابی رسول ﷺ ختنہ کی دعوت یہ کہہ کر ٹھکرا دیتے ہیں کہ ہمیں اس طرح کی دعوت نہیں دیجاتی تھی۔غور کرنا ہے کہ روزہ کشائی کی دعوت بھی جب وہاں نہیں تھی، تو اسکا کیا جواز ہوسکتا ہے۔

(۳) پھر اس میں جو اسراف اور فضولیات ہوتے ہیں، وہ اپنی جگہ مستقل ایک گناہ ہے، جسکا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

(۴) اس موقع پر بعض بلکہ بہت سے لوگ اس روزہ رکھوانے اور روزہ کشائی کی رسم کا اخبارات میں اعلان بھی دیتے ہیں اور ساتھ ہی بچے کی تصویر بھی شائع کرتے ہیں۔اسلام میں تصویر لینا، رکھنا، دوسروں کو بتانا، سب حرام و ناجائز ہے۔پھر اشتہار سے اسکی تشہیر خود ریاکاری پر مشتمل ہونے کی بنا پر ناجائز فعل ہے۔

اب غور فرما لیا جائے کہ اس رسم میں کس قدر ناجائز امور شامل ہیں، اس کے باوجود کیا یہ رسم جائز ہوسکتی ہے؟

ایک طرف تو بعض لوگوں کا یہ حال کہ غیر مکلّف بچوں کو بھی محض رسم کو پورا کرنے کے لیے اس پر مجبور کرتے ہیں اور دوسری طرف بعض لوگ روزہ کشائی کی غیر شرعی رسم کو ادا کرنے کی ہمت نہ ہونے کی وجہ سے بچوں کو روزہ ہی نہیں رکھواتے اور اس انتظار میں رہتے ہیں کہ اس رسم کو ادا کرنے کے لیے اتنے ہزار روپے جمع وفراہم ہوجائیں تو رکھوائیں گے۔اس طرح بعض بچے جوان بھی ہوگئے اور روزہ

(۱) مسند احمد بحوالہ اصلاح الرسوم: ۵۳، راہ سنت: ۱۴۲

رکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ غور کیجیے کہ محض ایک من گھڑت رسم کی خاطر بچوں کو روزہ نہ رکھوانا اور ان پر روزہ فرض ہونے کے بعد بھی اس سے غفلت برتنا کیسے جائز ہوسکتا ہے؟

پندرھویں روزے کی تعظیم:

کسی چیز کے مرتبہ کی بڑائی اور اس کی تعظیم، ایسی چیز ہے جو محض عقل کی بنیاد پر تراشی نہیں جاسکتی، بلکہ قرآن وحدیث کی دلیل ہی اس کی بنیاد بن سکتی ہے۔ مثلاً پنج وقتہ نمازوں کا جو درجہ ومقام ہے اور ان میں تفاضل ہے، وہ صرف دلیل شرعی کی بنیاد پر قائم ہوگا، محض اپنی عقل سے نہیں۔ اسی طرح روزوں کا مسئلہ بھی ہے کہ بلا شرعی دلیل کے کسی روزے کو کسی روزے سے بڑا اور زیادہ عظیم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مگر افسوس کہ بعض لوگ روزوں میں بھی کسی کو بڑا اور کسی کو چھوٹا قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ بہت سے عوام میں یہ مشہور ہے کہ منجھلا روزہ یعنی پندرھواں روزہ بڑا روزہ ہے، حالانکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں، یہ محض ایک من گھڑت عقیدہ اور بدعت ہے۔ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

"رمضان کی بدعت میں سے ایک یہ بھی ہے کہ منجھلے روزے کو افضل سمجھتے ہیں اور اس کے کچھ احکام بھی تراش رکھے ہیں جو سب بدعات ہیں۔ (۱)

لہٰذا اپنی جانب سے کسی روزے کو بڑا اور کسی کو چھوٹا نہیں سمجھنا چاہیئے، ہمیں اس کا اختیار نہیں ہے۔

تراویح میں نابالغ کی امامت:

تراویح میں نابالغ بچوں کو امام بنانے کا رواج بھی بہت سے مقامات پر زوروں پر ہے، بعض جگہ تو یہ تک ہوا ہے اور ہوتا ہے کہ بالغ حفاظ کے ہوتے ہوئے

(۱) اغلاط العوام مولانا تھانویؒ مرتبہ مولانا مہربان علی صاحب: ۱۲۷

بھی نابالغ حافظ کو امام بنا دیا جاتا ہے، یہ مسئلہ کہ تراویح میں نابالغ بچے کو امام بنانا درست ہے یا نہیں؟ اگر چہ اختلافی مسئلہ ہے، لیکن صحیح اور جمہور علماء کا پسندیدہ قول یہی ہے کہ نابالغ کی اقتداء کسی نماز میں بھی صحیح نہیں ہے، نہ تراویح میں اور نہ کسی اور نفل یا فرض میں۔ چنانچہ صاحب ''ہدایۃ'' نے فرمایا کہ:

''وفی التراویح والسنن المطلقةجوزہ مشائخ بلخ ولم یجوزہ مشایخنا والمختار انه لا یجوز فی الصلوات کلها.''

(اور تراویح اور سنت مؤکدہ میں بلخ کے مشائخ نے اس کو (یعنی نابالغ کی اقتداء کو) جائز قرار دیا ہے اور ہمارے مشائخ نے اس کو جائز نہیں قرار دیا ہے اور مختار قول یہی ہے کہ (نابالغ کی اقتداء) تمام نمازوں میں ناجائز ہے)۔(۱)

علامہ ابن نجیم مصریؒ نے لکھا ہے کہ یہی قول مختار ہے اور جمہور علماء کا ہے اور یہی ظاہر روایت ہے۔(۲)

اور وجہ یہ ہے کہ علامہ حصکفی نے ''درمختار'' میں اس کو اصح قرار دیا ہے۔(۳)

اور وجہ یہ ہے کہ اکثر علماء کے مطابق بچہ کی نماز حقیقت میں نماز ہی نہیں ہے، بلکہ نماز کی نقل ہے۔ لہٰذا اس کے پیچھے ایک ایسا آدمی جس پر نماز فرض یا سنت ہے، کس طرح نماز پڑھ سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن نجیمؒ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''نہایہ میں ہے کہ یہ اختلاف اس طرف راجع ہے کہ بچہ کی نماز، نماز ہے یا نہیں؟ کہا گیا ہے کہ وہ نماز نہیں ہے، بلکہ صرف عادت ڈالنے کے لئے اسکو نماز کا حکم دیا گیا ہے، اسی وجہ سے بالغ ہونے کے قریب پہنچی ہوئی لڑکی بغیر اوڑھنی نماز پڑھے، تو جائز ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ نماز ہے۔ اور اسی لئے مراہق (قریب البلوغ

(۱) ہدایہ:۱/۱۰۳ (۲) بحرالرائق:۱/۵۹ (۳) درمختار مع شامی:۱/۵۷۸

لڑکا) قہقہہ لگائے تو وضو کرنے کا حکم دیا جائے گا۔اس کے بعد علامہ ابن نجیم فرماتے ہیں: بظاہر اس کی ترجیح معلوم ہوتی ہے کہ بچہ کی نماز نماز نہیں ہے، اس لئے اس کی اقتداء میں کسی بھی نماز کا ناجائز ہونا مختار قول ہے۔(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ راجح بات یہ ہے کہ بچہ کی نماز نماز نہیں، بلکہ نفل نماز ہے، تو اس کے پیچھے بالغ شخص نماز نہیں پڑھ سکتا۔

ہمارے علماء نے بھی اس پر فتوی دیا ہے. چنانچہ مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں:
''فتوی اس پر ہے کہ نابالغ کے پیچھے تراویح بھی جائز نہیں، اگر کوئی بالغ حافظ نہ ملے تو ''الم ترکیف'' وغیرہ سے مختلف سورتیں پڑھ کر تراویح پڑھ لی جائے''۔(۲)

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندیؒ فرماتے ہیں:
''حنفیہ کا صحیح مذہب یہ ہے کہ نابالغ کی اقتداء بالغین کو فرض و نفل کسی میں بھی درست نہیں ہے، پس تراویح بھی نابالغ کے پیچھے نہیں ہوتی، یہی حنفیہ کا صحیح مذہب ہے۔(۳)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ آج بہت سے مقامات پر جو یہ رواج ہے کہ نابالغ بچوں سے قرآن سننے کے شوق میں، ان کو تراویح میں امام بنا دیا جاتا ہے، یہ غلط ہے۔ اگر بچوں کو عادت ڈالنے یا ان کی ہمت افزائی کے لئے امام بنانا ہو تو ان کے پیچھے نابالغ بچوں کو نماز پڑھائیں۔اس سے ان کو عادت بھی پڑ جائے گی اور بڑے لوگوں کا شوق بھی پورا ہو جائے گا۔

۞ نمک پر افطاری کی رسم:

شریعت میں افطاری کسی بھی چیز سے کی جا سکتی ہے۔البتہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بہتر اور افضل یہ ہے کہ کھجور سے اور کھجور نہ ہو تو پانی سے افطار ہو۔امام

(۱)البحر الرائق:۳۵۹/۱ (۲)امداد المفتین :۳۶۳ (۳)عزیز الفتاویٰ:۱۹۶

ترمذی وابوداوٗدؒ نے حضرت سلمان بن عامرؓ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اِذَاافْطَرَ اَحَدُکُمْ فَلْیُفْطِرْ عَلٰی تَمرٍفَاِنْ لَمْ یَجِدْفَلْیُفْطِرْ عَلٰی مَاءٍ فَاِنَّہٗ طَھُوْرٌ.

(جب تم میں سے کوئی افطار کرے تو چاہئے کہ کھجور پر افطار کرے اور اگر نہ پائے تو پانی پر کرے؛ کیونکہ وہ پاک کرنے والا ہے۔)(۱)

اور خود آپ ﷺ کا بھی یہی عمل تھا؛ چنانچہ حدیث میں ہے

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِک قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ یُفْطِرُ قَبْلَ اَنْ یُّصَلِّیَ عَلٰی رُطَبَاتٍ فَاِنْ لَمْ تَکُنْ رُطَبَاتٍ فَتُمَیْرَاۃٌ فَاِنْ لَمْ تَکُنْ تُمَیْرَاۃٌ حَسَا حَسْوَاۃٌ مِنْ مَّاءٍ.

(آپ ﷺ نمازِ (مغرب) سے قبل چند تر کھجور پر افطار کرتے اور اگر تر کھجور نہ ہوتے تو چھواروں پر کرتے اور وہ بھی نہ ہوتے تو چند چلو پانی لیتے۔)

پہلی حدیث کو امام ترمذی نے صحیح قرار دیا ہے۔(۲)

اور امام ابوعبداللہ حاکم نے صحیح علی شرط البخاری کہا ہے۔(۳)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ سنت یہ ہے کہ کھجور یا پانی پر افطار کیا جائے، اس کے علاوہ کسی اور چیز کو اپنی طرف سے متعین کرنا ''ایجاد بندہ'' کی فہرست میں داخل ہے۔

مگر افسوس کہ ہمارے ان علاقوں میں بہت سے لوگوں اور خاص طور پر بوڑھی عورتوں میں نمک پر افطاری کا ایک خودساختہ طریقہ رائج ہے اور اس طریقہ کو مستحب سے بھی بڑھا کر درجۂ وجوب تک پہنچا دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اوپر کی حدیث اور معمول نبوی کے برخلاف کسی چیز کو اپنی طرف

(۱) سنن ترمذی: ۱۴۹/۱ (۲) سنن ترمذی: ۱۵۰/۱ (۳) بحوالہ بذل المجہود: ۱۴۱/۴

سے ضروری یا مستحب خیال کر لینا اور اس کی عملی پابندی کرنا نہ صرف یہ کہ بدعت ہے ، بلکہ ایک درجہ میں سنت کا مقابلہ بھی ہے ، بلکہ صحیح بات یہ کہ ہر بدعت میں سنت کا مقابلہ ہوتا ہے، لہذا اس طریقہ کی پابندی بلاشبہ غلط ہے اور واجب الترک ہے۔

ہاں بلا پابندی اور بلا اعتقاد، یوں ہی کوئی نمک سے افطاری کر لے تو اس کی بھی بلا شبہ اجازت ہے ۔مگر اس کو خاص اعتقاد اور ثواب کی نیت سے اختیار کرنا محض بدعت ہے۔

مساجد میں افطاری کا رواج:

ہمارے معاشرے میں اکثر لوگ مساجد میں افطار کرنے کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور اس کا بڑا اہتمام فرماتے ہیں اور بہت ساری مساجد میں لوگ بڑے بڑے خوان بچھاتے اور ان پر متعدد ماکولات ومشروبات کا انتظام فرماتے ہیں ، حالانکہ مساجد میں کھانے اور پینے سے علماء نے سختی سے منع فرمایا ہے اور صرف ضرورت پر اس کی اجازت دی ہے، جیسے مسافر کو گھر بار نہ ہونے کی وجہ سے اس کی ضرورت لاحق ہوتی ہے یا اعتکاف کرنے والے کو اسکی ضرورت ہوتی ہے۔ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کو مسجد میں کھانے پینے سے منع کیا گیا ہے۔

علامہ حصکفیؒ ''درمختار'' میں فرماتے ہیں کہ:

''مکروہ ہے(مسجد) میں کھانا اور سونا، مگر معتکف اور مسافر کو (جائز ہے) (۱)

اسی طرح علامہ ابن نجیمؒ نے ''الاشباہ والنظائر'' میں لکھا ہے کہ:

''منع کیا جائیگا کھانے اور سونے سے غیر معتکف اور غیر مسافر کو''۔(۲)

معلوم ہوا کہ مسجد میں کھانے اور پینے کی اجازت نہیں ہے؛ کیونکہ مسجد عبادت

---

(۱) درمختار مع شامی:۱/۶۶۱ (۲) الاشباہ مع الحموی:

گاہ ہے جو بلا ضرورت ان چیزوں کی متحمل نہیں ہو سکتی ہے۔ اسی لئے کبھی بضرورت کسی کو مسجد میں کھانے سونے کی بات پیش آئے تو علماء نے لکھا کہ اعتکاف کی نیت کر کے پہلے کچھ دیر ذکر واذکار میں مشغول ہو جائے، پھر کھائے پئے۔ جیسا کہ شامیؒ اور حمویؒ نے تصریح کی ہے۔(۱)

مگر یہ غیر مسافر وغیر معتکف کو بضرورت کھانے پینے کی صورت میں بہ نیت اعتکاف اس کی اجازت دی گئی ہے۔ بے ضرورت کھانے پینے کا مشغلہ بنالینا اور اس کے لیے اعتکاف کی نیت کر لینا غلط ہے؛ کیونکہ ہر کام مقصد کے تابع ہوتا ہے، لہذا کھانا پینا مقصد ہو گا تو اعتکاف کی نیت کر لینے سے اس پر کیا فرق پڑ سکتا ہے؟ ہاں ضرورت کے مواقع اس سے ضرور مستثنی ہوں گے۔

اس کے علاوہ مسجد میں افطار کے موقع پر جو شور وغل اور بچوں کا دوڑنا اور گھومنا اور افطاری کے سامان کی چھینا جھپٹی، اور اس کے لیے ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا، بلکہ دھکے دینا اور مسجد کے فرش کو ملوث کرنا وغیرہ، جو امور پیش آتے ہیں، ان کے پیش نظر کسی صورت میں مسجد میں افطاری کی اجازت نہیں دی جا سکتی، لہذا اہل محلّہ کو چاہئے کہ یا تو گھروں میں افطار کر کے مسجد کو آئیں یا مسجد کے باہر آس پاس اس کا انتظام کریں، تاکہ مسجد کی بے حرمتی نہ ہو۔

صبح صادق کے بعد سحری:

رمضان مبارک میں جو بے احتیاطیاں ہوتی ہیں، ان میں سے ایک عام بے احتیاطی یہ ہوتی ہے کہ لوگ صبح صادق ہونے بعد بھی کھانے پینے میں مشغول رہتے ہیں، اور بعض لوگ اذان تک اور بعض اذان کے ختم ہونے تک بھی کھاتے رہتے ہیں، حالانکہ صبح صادق ہو جانے کے بعد کھانے پینے کی اجازت نہیں اور اس سے

(۱) شامی: ۶۶۱/۱، غمز عیون البصائر للحموی: ۶۰/۴

روزہ اکارت جاتا ہے۔

قرآن کریم نے بصراحت سحری کے انتہائی وقت کو بتا دیا ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ [بقرہ:۱۸۷]

(کھاؤ اور پیو اس وقت تک کہ تم کو سفید خط صبح (صادق) کا ممتاز ہو جائے سیاہ خط سے (یعنی رات سے)

اس سے معلوم ہوا کہ سحری کا انتہائی وقت صبح صادق کا ظاہر ہونا ہے، اور صبح صادق کے یقینی طور پر ظاہر ہو جانے کے بعد ایک منٹ کے لیے بھی کھانا پینا روزہ کو فاسد کر دیتا ہے اور صبح کا یقین ان چارٹوں سے ہو سکتا ہے جو رمضان میں اوقات سحر وافطار ہی پر مشتمل شائع کئے جاتے ہیں۔ اس میں بتائے ہوئے وقت کے مطابق سحری کا ختم کر دینا ضروری ہے تا کہ روزہ فساد کا شکار نہ ہو جائے۔

بعض لوگ بعض حدیثوں کی بنا پر سحری کو صبح صادق کے بعد بھی جاری رکھنے کی اجازت دیتے ہیں، مگر یہ دراصل ان حضرات کو احادیث نہ سمجھنے سے دھوکہ لگا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ صبح صادق کے بعد کھانے، پینے کی اجازت نہیں ہے، اور جن حدیثوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اذان کے بعد بھی کھا سکتے ہیں، ان کا مطلب یہ ہے کہ اذان اگر فجر سے پہلے ہو جائے، جیسے حضرت بلال ؓ کی اذان پہلے ہوتی تھی تو کھانے کی اجازت ہے، مگر صبح صادق کے بعد اجازت نہیں ہے۔ تفصیل کے لیے کتب حدیث اور ان کی شروحات دیکھئے۔ (۱)

۞ تراویح کی مروجہ دعائیں:

تراویح کی نماز کے ہر ترویحہ (چار رکعت) پر استراحت کرنے کو مستحب

(۱) مثلاً بذل المجهود وغیرہ

قرار دیا گیا ہے، مگر اس موقع پر کیا پڑھنا یا کیا کرنا چاہئے، اسکی کوئی تعیین نہیں کی گئی، بلکہ اس موقع پر ہر شخص کو آزاد رکھا گیا ہے اور اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جو چاہے کرے، خواہ ذکر واذکار میں مشغول ہو یا نفل نماز پڑھے، یا خاموش بیٹھا رہے۔ چنانچہ حضرات فقہاء نے اس کی تصریح فرمائی ہے:

چنانچہ علامہ ابن نجیم مصری ؒ ''شرح کنز'' میں لکھتے ہیں:

''فقہاء نے کہا ہے کہ لوگ بیٹھنے کی حالت میں مختار ہیں اگر چاہیں تو تسبیح پڑھیں، اور اگر چاہیں تو قرآن کی تلاوت کریں اور اگر چاہیں تو تنہا چار رکعت نفل پڑھیں اور چاہیں تو خاموش بیٹھے رہیں۔ اور مکہ والے (اس وقت) ایک ہفتہ طواف کرتے ہیں اور دو رکعت نفل پڑھتے ہیں اور مدینہ والے چار رکعت نفل پڑھتے ہیں۔ (۱)

اسی طرح علامہ ابو بکر الحدادی یمنیؒ نے ''الجوہرۃ النیرۃ'' میں لکھا ہے کہ:

''اس جلسہ استراحت میں اختیار ہے، چاہے تو تسبیح پڑھے، ذکر کرے یا خاموش انتظار کرتا رہے اور اس وقت نماز پڑھنے کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے، بعض نے مکروہ کہا ہے اور بعض نے مستحب کہا ہے۔ (۲)

اسی طرح علامہ حصکفی نے ''درمختار'' میں اور علامہ شامی نے ''ردالمحتار'' میں لکھا ہے۔ (۳)

ان تمام عبارات کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر چار رکعت پر اتنی ہی دیر جتنے وقت میں چار رکعت ہوئی ہے، بیٹھنا مستحب ہے اور اس وقت اختیار ہے، چاہے تسبیح پڑھے یا قرآن یا اور کوئی وظیفہ یا خاموش بیٹھا رہے او نماز پڑھنے کے بارے میں اختلاف ہے، بعض نے مکروہ کہا ہے اور بعض نے اجازت دی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت کے لیے کوئی خاص ذکر یا دعا منقول نہیں ہے،

---

(۱) البحرائق: ۶۹/۲ (۲) الجوہرۃ النیرۃ: ۱۴۰/۱ (۳) دیکھو درمختار مع شامی: ۴۶/۲

بلکہ اپنے طور سے اگر کوئی ذکر بغیر تخصیص کے پڑھ لے تو جائز ہے۔

مگر افسوس کہ ہمارے شہروں اور دیہات کی اکثر مساجد میں بعض دعائیں اور اذکار خصوصیت کے ساتھ اور واجب کی طرح التزام کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں، حالانکہ ابھی اوپر ثابت ہوا کہ اس سلسلے میں کوئی دعا و ذکر خصوصیت سے ثابت نہیں اور اس وقت ہر شخص کو اختیار ہے، لہٰذا یہ تخصیص و التزام بلاشبہ دین میں اضافہ اور بدعت ہے۔

مثلاً بعض جگہ: " فضل من اللّٰہ ونعمة ومغفرة ورحمة الخ" ہر دو رکعت پر اور پھر ہر چار رکعت پر بالترتیب، رسول اللہ ﷺ پر درود، حضرت صدیق اکبرؓ، عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علیؓ کی ثناء ومنقبت اور ان پر دعاء رحمت کے الفاظ پڑھے جاتے ہیں، اور ان پر اتنا التزام اور اتنی پابندی کہ انکے ترک پر مستقل نزاع اور جھگڑا قائم ہو جاتا ہے، اور نہ پڑھنے والوں کو ملامت کی جاتی ہے ۔اولاً تو ان دعاؤں کا ثبوت نہیں ہے، بلکہ یہ کسی شخص کی بنائی ہوئی ہیں۔

لہٰذا ان دعاؤں کو نماز تراویح کے ترویحوں میں پڑھنے کا رواج اپنی طرف سے تخصیص ہے، پھر اس پر واجبات کی طرح التزام کیا جاتا ہے جو دوسری غلطی ہے، پھر ہر دو رکعت پر دعا بھی غلط ہے؛ کیونکہ استراحت کا حکم چار رکعت پر ہے۔اسی لیے علماء نے دو رکعت پر نماز کو بدعت ومکروہ قرار دیا ہے، چنانچہ "درمختار" میں اس کو مکروہ کہا ہے اور شامیؒ نے اس کے مکروہ ہونے کی وجہ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ استراحت چار رکعت پر ہے نہ کہ دو رکعت پر۔ (۱)

اور شامیؒ نے "منحۃ الخالق" میں رملیؒ سے اس کا بدعت ہونا نقل کیا ہے۔ (۲)

اس سے معلوم ہوا کہ جب دو رکعت پر استراحت نہ ہونے کی وجہ سے نماز درست نہیں تو دعا بھی درست نہیں، لہٰذا یہ دعاء کا طریقہ تیسری غلطی ہے۔اس لیے یہ

(۱) درمختار مع شامی: ۴۶/۲ (۲) منحۃ الخالق علی البحر الرائق: ۶۹/۲

بدعت میں داخل ہے۔

یہاں یہ بات بھی صاف ہو جانا چاہیے کہ بعض کتب فقہ میں چار رکعت پر درج ذیل دعاء پڑھنے کی نشاندہی کی گئی ہے:

"سبحان ذی الملک والملکوت سبحان ذی العزۃ والعظمۃ والھیبۃ والقدرۃ الخ "

مگر یہ بھی ضروری ولازم نہیں اور نہ ہی یہی دعا اس وقت کے لیے مخصوص ہے۔فقہاء کے طرز سے یہی ثابت ہوتا ہے، چنانچہ علامہ شامیؒ نے علامہ قہستانی کے حوالہ سے یہ دعا نقل کی ہے، مگر یہ دعا انہوں نے "درمختار" کے اس قول کی شرح میں نقل کی ہے کہ:

"اس وقت لوگوں کو اختیار ہے تسبیح، قرأت، خاموشی یا تنہاء نماز پڑھنے میں۔"(۱)

اس پر شامیؒ نے لکھا ہے کہ تسبیح میں یہ پڑھا جائے (جو اوپر نقل ہوا) یہ طرز صاف بتا رہا ہے کہ یہ تسبیح ضروری نہیں اور نہ ہی مخصوص ہے۔البتہ تسبیح میں اس کو بھی پڑھا جا سکتا ہے، لہٰذا اس پر بھی اس طرح التزام کہ واجب معلوم ہو اور اس کی تخصیص نہ کی جائے۔

۞ سحری میں جگانے کے غیر مہذب طریقے:

اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ رمضان مبارک میں سحری کے لیے لوگوں کو بیدار کرنا ثواب کا کام ہے اور احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ زمانۂ رسالت میں بھی لوگوں کو جگانے کا انتظام تھا، مثلاً حدیث میں ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لَایَمْنَعَنَّ اَحَدًامِّنْکُمْ اَذَانُ بِلاَ لٍ مِّنْ سُحُوْرِہٖ فَاِنَّہٗ یَاْذَنُ لِیَرْجِعَ قَائِمُکُمْ وَیُوْقِظَ نَائِمُکُمْ.

(۱) درمختار مع شامی:۲/۴۶

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی کسی کو بلالؓ کی اذان سحری سے نہ روکے؛ کیونکہ وہ رات میں (صبح صادق سے قبل) اس لئے اذان دیتے ہیں تا کہ تہجد میں مشغول لوگ لوٹ جائیں (اور سحری کر لیں) اور سونے والے جاگ اٹھیں۔ (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت بلالؓ زمانۂ رسالت میں لوگوں کو بیدار کرنے کے لیے اذان کہا کرتے تھے، لہٰذا بیدار کرنے کے لیے تدبیر کرنا بلا شبہ دائرۂ سنت کی چیز ہے اور ثواب کا کام ہے، مگر یہ بات بھی شبہ سے بالاتر ہے کہ بیدار کرنے کے لیے ناشائستہ اور غیر مہذب طریقہ اپنانا غلط بات، اسی طرح ناجائز طریقہ اپنانا ناجائز ہے۔

مثلاً بعض لوگ جو روزہ داروں کو سحری کے لیے جگانے اور ثواب کمانے کا بے حد جذبہ رکھتے ہیں، وہ زور زور سے چیخ کر یا بیہودہ آواز نکالکر یا فلمی گانوں کو گا کر یا میوزک اور باجے کے ذریعہ لوگوں کو بیدار کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ ناشائستہ ہونے کے ساتھ ناجائز بھی ہے، لہذا ان نیک جذبات کو، اچھے اور جائز طریقے سے پورا کرنا چاہیئے۔

اس میں اس کا بھی خیال ہو کہ بیمار، بچے اور غیر مکلّف لوگ تکلیف محسوس نہ کریں، اور کفار و مشرکین کے دلوں میں اسلام کے بارے میں بدگمانی پیدا نہ ہو جائے، بلکہ ایسا طرز عمل اور طریقہ اختیار کیا جانا چاہیئے کہ لوگوں کو بیدار کرنے کا مقصد بھی پورا ہو جائے اور کسی کو تکلیف بھی نہ ہو اور نہ اسلام اور اسکی کی تعلیمات پر کوئی حرف آئے؛ کیونکہ کفار و مشرکین ہماری بدتہذیبی کو اسلام کی تعلیم کا نتیجہ قرار دے لیں گے، تو ہم اسلام کے بارے میں بدگمانی کا ذریعہ وسبب بنیں گے۔ اس لیے اس طرح کی بے تکی و ناشائستہ حرکات سے ضرور احتراز کرنا چاہیئے۔

---

(۱) بخاری: ۱/ مسلم: ۱/ ۳۵۰

رمضان کے آخری جمعہ میں خطبۃ الوداع کا التزام:

رمضان مبارک کے چلے جانے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے، رمضان کے آخری جمعہ میں الوداع، الفراق، اسلام پر مشتمل خطبہ پڑھا جاتا ہے جس کو خطبۃ الوداع بھی کہتے ہیں، اس میں دو باتیں خلاف شریعت ہیں:

(۱) ایک یہ کہ رمضان کے جانے پر افسوس و تاسف کا اظہار کرنا رسول اللہ ﷺ اور حضرات صحابہ کرام سے ثابت نہیں ہے، بلکہ فی الجملہ خوشی کا اظہار کرنا ثابت ہے؛ کیونکہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ عید الفطر انعام اور مغفرت کا دن ہے۔ نیز اس دن خوشی کرنے اور اچھے کپڑوں اور کھانوں سے اس کا اظہار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، لہٰذا اس کے برخلاف افسوس و رنج کا اظہار کرنا خلاف شرع کام ہے۔

چنانچہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ اپنے ایک فارسی میں لکھے گئے فتوی میں فرماتے ہیں، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ:

" خطبۃ الوداع کا حاصل رمضان کے پورا ہونے پر افسوس کا اظہار کرنا ہے اور اس طرح کا افسوس ظاہر کرنا حضرت نبی کریم اور صالحین خیر القرون میں کسی جگہ منقول نہیں ہے۔ بلکہ غور کریں تو تاسف کے بجائے ایک گونہ سرور و مسرت ختم رمضان پر مطلوب معلوم ہوتی ہے۔"(۱)

(۲) دوسری بات یہ کہ اس رسم کو لازم و واجب کی طرح انجام دیا جاتا ہے اور بہت سے لوگ اس بات کو ضروری سمجھتے ہیں کہ آخری جمعہ رمضان میں خطبۃ الوداع والفراق پڑھا جائے۔ ظاہر ہے کہ جس بات کو شریعت میں لازم نہیں کیا گیا اس کو لازم قرار دے لینا بدعت ہے، اگرچہ فی نفسہ وہ بات خلاف شرع نہ بھی ہو۔ چنانچہ علامہ عبد الحی لکھنویؒ نے فی نفسہ خطبۃ الوداع کو مباح قرار دینے کے باوجود اس کے

---

(۱) امداد الفتاوی: ۱/۶۸۵

التزام کو بدعت قرار دیا ہے۔آپ فرماتے ہیں:

"لیکن اہتمام کرنا خطبۂ وداع کا جیسا کہ اس زمانہ میں مروج ہے اور اس کو حد التزام تک پہنچانا خالی ابتداع (بدعت) سے نہیں، علماء معتمدین کو لازم ہے کہ اس طریقے کے التزام کو چھوڑیں تا کہ عوام اعتقاد استحباب وسنیت بلکہ ضروری ہونے اس طریقہ خاص سے نجات پاویں۔(۱)

الغرض یہ رسم بھی قابل ترک ہے تا کہ بدعت سے بچا جا سکے اور اصل دین پر محافظت ہو سکے۔

عیدالفطر کی سویاں:

عیدالفطر کے دن عید گاہ جانے سے قبل کچھ کھا لینا سنت ہے اور رسول اللہ ﷺ کا معمول یہ تھا کہ عید گاہ تشریف لے جاتے تھے اور کھجور بھی طاق عدد استعمال فرماتے تھے۔(۲)

لہٰذا کھجور کا اہتمام کرنا بھی سنت ہے اور علماء نے لکھا ہے کہ اگر اس کا انتظام نہ ہو تو کسی میٹھی چیز کا کھانا بہتر ہے۔(۳)

مگر اس دن کے لیے اپنی طرف سے کسی خاص چیز کا التزام کرنا، من گھڑت بات ہے، جیسے بہت سے لوگ عیدالفطر کے دن صبح سویاں (شیر خرما) پکاتے ہیں اور اس کا پورا اہتمام کرتے ہیں اور سنت کی طرح اس کی پابندی کی جاتی ہے، حالانکہ خاص یہ چیز سنت نہیں ہے، بلکہ سنت تو کھجور ہے یا بعد کے درجہ میں کوئی بھی میٹھی چیز۔ اس عمومیت میں خصوصیت پیدا کرنا بلاشبہ من مانی ہے، جس سے بچنا چاہئے۔

کہنا یہ نہیں کہ سویاں پکانا غلط یا برا ہے، بلکہ یہ بتانا ہے کہ اس کو خاص کر لینا اور اسی پر ہمیشہ پابندی کرنا غلط و من گھڑت ہے۔

(۱) مجموعۃ الفتاوی:۲۱۸/۱ (۲) بخاری مع فتح الباری:۴۴۶/۲ (۳) درمختار مع شامی:۱۶۸/۲

حضرت حکیم الامت تھانویؒ ''اصلاح الرسوم'' میں فرماتے ہیں:

''عید الفطر میں سویاں پکانے فی نفسہ مباح (جائز) ہے مگر لوگوں نے اس میں خرابیاں پیدا کر لی ہیں)ا(اس کو ضروری سمجھتے ہیں حتی کہ سویاں نہ پکائی جائیں تو عید ہی نہیں ہوئی، اس کی پابندی کی بدولت یہاں تک نوبت پہنچتی ہے کہ اگر پاس نہ ہو تو قرض لیکر گو سود ہی پر ملے، ضرور اس کا اہتمام کرتے ہیں۔(۱)

اور بعض لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت فاطمہؓ نے عید الفطر میں سویاں بنائی تھیں، یہ آپ پر تہمت اور الزام ہے۔ کسی حدیث میں اس کا ذکر نہیں ملتا، لہذا یہ رسم بھی قابل اصلاح ہے.

خطبۂ عید کی زبان:

عیدین اور جمعہ کے خطبات میں مسنون طریقہ یہ ہے کہ دو خطبے عربی بان میں پڑھے جائیں؛ کیونکہ جناب رسالت مآب ا اور حضرات صحابہ و تابعین اور اس کے بعد بھی ہزار برس سے زیادہ عرصہ تک پوری اسلامی دنیا میں یہی طریقہ چلا آ رہا تھا، لہذا عربی زبان میں دو خطبات کا ہونا سنت ہے۔

چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ''مصفی شرح موطا'' میں لکھتے ہیں کہ:

''جب ہم نے رسول اللہ ﷺ اور حضرات صحابہ اور خلفاء راشدین کے خطبات کو ملاحظہ کیا تو اس سے چند چیزوں کی تنقیح ہوئی کہ ان خطبات میں حمد باری تعا لی، شہادتین، درود، تقوی کا حکم آیت قرآن کی تلاوت، مسلمانوں کے لیے دعا اور خطبات کا عربی میں ہونا پایا گیا........آگے فرماتے ہیں کہ اس کا عربی میں ہونا اس لیے کہ مشرق و مغرب میں مسلمانوں کا عمل اسی پر مستمر ہے، حالانکہ بہت سے مما لک

(۱) ملخصا اصلاح الرسوم: ۱۴۹

میں ان کے مخاطب عجمی تھے۔(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ خطبہ کا عربی میں ہونا بھی خطبہ کی اہم ترین سنتوں میں سے ہے ایک ہے، بلکہ بعض علماء نے خطبہ کا عربی میں ہونا خطبہ کے صحیح ہونے کی شرط قرار دیا ہے۔ چنانچہ علامہ نووی شافعیؒ نے اپنی کتاب ''الاذکار'' میں لکھا ہے کہ:

''خطبہ جمعہ اور دوسرے خطبات کا عربی میں ہونا شرط ہے۔''(۲)

حضرات علماء کی ان تصریحات کے باوجود اکثر مقامات پر خطبات جمعہ وعیدین غیر عربی میں ہوتے ہیں، جو کہ سراسر بدعت اور مکروہ ہے۔ حضرت مولانا عبد الحی لکھنویؒ اسی بدعت پر تنبیہ فرماتے ہوئے اپنے ایک عربی فتوی میں لکھتے ہیں:

''انہیں (مروجہ بدعات میں) سے جمعہ کے دن اور عیدین میں غیر عربی زبان میں خطبہ دینا ہے یا اس کا عجمی زبان میں ترجمہ کرنا ہے، یہ طریقہ خیر القرون کے بعد بلا علم کے لوگوں نے ایجاد کیا ہے۔(۳)

اسی فتوے کے آخر میں بطور خلاصہ مضمون تحریر فرماتے ہیں کہ:

''خطبہ کل یا اس کا بعض حصہ غیر عربی میں پڑھنا مکروہ اور خلاف سنت متوارثہ ہے؛ کیونکہ اسلام کے صدر اول سے باوجود اس کے ضرورت کے اس کا ثبوت نہیں ملتا خصوصا جب کہ بہت سے ممالک فتح ہو گئے اور اسلام مختلف دیار کے پھیل گیا (پھر بھی اس کا ثبوت نہیں ملتا)(۴)

الغرض جمعہ اور عیدین کا خطبہ غیر عربی زبان میں نہیں ہونا چاہئے کہ یہ سنت کے خلاف ہے، بلکہ عربی ہی میں دو خطبے ہونا چاہئے۔ یہاں بعض سطحیت پسند علماء سے فاش غلطی ہوئی ہے، وہ یہ کہ لوگ کتب فقہ سے امام اعظم ابوحنیفہؒ سے یہ قول نقل

(۱) بحوالہ مجموعۃ الفتاوی عبدالحی لکھنوی:۲/۲۴۸ (۲) بحوالہ مجموعۃ الفتاوی:۲/۲۴۸

(۳) ایضا:۲/۲۴۷ (۴) ایضا:۲/۲۵۲

کرتے ہیں کہ آپکے نزدیک غیر عربی میں خطبہ جائز ہے اور اس سے غیر عربی میں خطبہ کے جواز پر استدلال کرتے ہیں۔مگر حقیقت یہ ہے کہ امام صاحب کے قول میں جواز کے معنی صحیح ہو جانے کے ہیں، جو فاسد کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے، نہ کہ گناہ نہ ہونے کے معنی جو حرام ومکروہ کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔اور اس کی کتب فقہ میں بے شمار مثالیں ملیں گی کہ حضرات فقہاء نے جائز کا لفظ صحیح کے معنی میں استعمال کیا ہے، اگرچہ وہ کام مکروہ و ناجائز کیوں نہ ہو۔ یہاں اسکی ایک دو مثالوں پر کفایت کی جاتی ہے۔فقہاء نے لکھا ہے کہ تکبیر تحریمہ میں اللہ اکبر کے بجائے کوئی اللہ اجل یا اللہ الرحمٰن وغیرہ الفاظ کا استعمال کرے تو جائز ہے۔ (۱)

حالانکہ خود فقہاء کرام نے اسکو مکروہ تحریمی قرار دیا ہے۔ (۲)

اسی طرح خطبۂ جمعہ کو بغیر وضو پڑھنا فقہاء نے جائز قرار دیا اور مکروہ بھی بتایا ہے۔ (۳)

اور اس کو جو بغیر وضو خطبہ دے گنہگار بھی قرار دیا ہے۔ (۴)

غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ایک کام کو فقہاء جائز بھی کہتے ہیں اور مکروہ بھی اور اس جائز کام کے مرتکب کو گنہگار بھی، آخر اس کی کیا توجیہ ہے؟ یہی توجیہ ہے کہ جواز کے معنی صحیح ومنعقد ہو جانے کے ہیں، اگرچہ وہ کام ناجائز ومکروہ ہو۔اس کی اصولی بحث کو احقر نے اپنے ایک رسالہ ''املاک مساجد'' میں ذرا تفصیل سے لکھا ہے۔ (۵)

اسی طرح زیر بحث مسئلہ میں امام اعظم نے جو فرمایا ہے کہ غیر عربی میں خطبہ جائز ہے، اس کا معنی یہی ہے کہ خطبہ ہو جائے گا، اگرچہ مکروہ و ناجائز ہے۔ چنانچہ علامہ عبدالحی لکھنویؒ فرماتے ہیں کہ:

---

(۱) شرح وقایہ مع چلپی: ۳۸ (۲) دیکھو در مختار مع شامی: ۱/۴۸۳ (۳) مختصر القدوری: ۳۶
(۴) شامی علی الدرر: ۲/۱۵۰ (۵) دیکھو املاک مساجد: ۱۰۔۱۱

''اس حکم (جواز) میں اور حکم کراہت میں کچھ منافات (مخالفت) نہیں ، صدہا جگہ فقہاء ''یجوز'' و''یصح'' (جائز وصحیح ہے) لکھتے ہیں اور غرض انکی نفس اجزاء وکفایت وجواز بالمعنی الاعم ہوتی ہے، نہ کہ اباحت مطلقہ خالیہ عن الکراہۃ.....اس کے بعد فقہاء کی عبارات نقل کرکے آگے فرماتے ہیں: پس خوب واضح ہوگیا کہ خطبہ غیر عربیہ کی کراہت کا حکم مخالف اقوال فقہاء کے کسی طرح نہیں۔(۱)

حاصل کلام یہ ہے کہ غیر عربی زبان میں جمعہ وعیدین کا خطبہ مکروہ وبدعت ہے اور فقہاء نے جو جائز لکھا ہے ، ان کی مراد اس سے خطبہ کا ہوجانا ہے، اگر چہ مکروہ ہوتا ہے۔اس تفصیل سے ان علماء کی غلطی واضح ہوگئی جنہوں نے فقہاء کے کلام سے غیر عربی خطبہ کا جواز ثابت کرنے کی کوشش کی ہے. جیسے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے اپنی کتاب ''جدید فقہی مسائل'' میں کیا ہے کہ فقہاء کی ان عبارات کو جواز بمعنی مباح لے لیا، پھر بعض علماء کی طرف غلط انتساب بھی کردیا مثلاً علامہ عبدالحی لکھنویؒ کی طرف جواز کا قول منسوب کردیا پھر آپ کے حوالہ سے حضرت شاہ محدث دہلوی کی طرف بھی جواز کا قول منسوب کردیا، حالانکہ یہ بات صحیح نہیں۔اوپر ہم نے علامہ عبد الحیؒ کا فتوی نقل کردیا ہے۔اس کو ملاحظہ فرمالیں تو مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی بات کا صحیح نہ ہونا ظاہر ہوجائے گا۔(واللہ اعلم)

❁نماز وخطبۂ عید کے بعد دعاء:

عید کی نماز اور خطبہ کے بعد دعاء کا کیا حکم ہے؟ اس پر حضرات علماء کے مابین بحث آئی ہے اور صحیح یہ ہے کہ دعاء کے لیے چونکہ کوئی وقت مقرر نہیں ہے اور نماز وخطبہ کے بعد بھی کی جاسکتی ہے، اس لیے عید کی نماز اور عید کے خطبہ کے بعد دعاء کرنا فی نفسہ مباح ہے، اور یہ جواز کا ثبوت عمومات حدیث سے ہوگا؛ کیونکہ احادیث کے عموم

(۱) مجموعۃ الفتاوی:۲/۳۷۸۔۳۷۹

سے نماز کے بعد اور اسی طرح کسی نیک کام کے بعد دعاء کرنا ثابت ہے، پس اسی عموم سے فی حد ذاتہ نماز وخطبہ عید کے بعد دعاء جائز ہے، اگر چہ بطور خاص آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے اسکا ثبوت نہیں ہے، جیسا کہ علامہ عبدالحیؒ نے لکھا ہے۔ (۱)

مگر یہاں دو باتوں پر توجہ کرنا ضروری ہے، ایک تو یہ کہ عمومات حدیث سے بلا شک نماز وخطبہ عید کے بعد دعاء کا جواز ثابت ہوتا ہے، مگر اسکا وجوب یا التزام ثابت نہیں ہوتا، لہٰذا اسکی ایسی پابندی کرنا جیسی واجب امور کی کی جاتی ہے، بلا شبہ حد سے تجاوز اور بدعت ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ نماز وخطبہ دونوں کے بعد اور ان میں بھی زیادہ اہمیت سے نماز کے بعد دعاء کرنے کا ثبوت ہوتا ہے، لہذا بلا تخصیص دونوں کے بعد یا اہمیت سے نماز کے بعد دعاء کر لی جائے تو بلا شبہ جائز ہے۔ مگر نماز کے بعد دعاء کرنے کو برا سمجھنا اور خطبہ کے بعد دعاء کو ضروری سمجھنا یہ بلا شبہ تجاوز اور بدعت ہے۔ جیسا کہ بالکل ظاہر ہے۔

اس کے بعد ملاحظہ فرمائیے کہ ہمارے ان علاقوں میں دعاء کے متعلق ان دونوں اصولوں کی خلاف ورزی جاری ہے کہ اولا تو نماز کے بعد دعاء نہیں کرتے اور اسکو غلط سمجھتے ہیں اور بعد خطبہ دعاء کو ضروری خیال کرتے ہیں، یہ اپنی طرف سے من گھڑت اور خلاف شرع بات ہے، لہذا اس رسم کو ترک کرنا چاہئے۔ چنانچہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

”اگر چہ دعاء ہر وقت جائز ہے مگر تخصیص بلا دلیل شرعی ہے، البتہ بعد نماز کے آثار کثیرہ میں مشروع ہے اور دبر الصلوۃ (بعد نماز) اوقات اجابت دعاء بھی ہے۔

(۱) مجموعۃ الفتاوی: ۱/۱۲۶

بہر حال بعد نماز دعاء نہ کرنا اور بجائے اس کے بعد خطبہ مقرر کرنا تغییر سنت ہے اور قابل احتراز۔ (۱)

حاصل یہ کہ دعاء کبھی بھی کی جاسکتی ہے، البتہ ایک وقت کو اپنی جانب سے دعاء کیلئے خاص کرنا اور دوسرے وقت کو دعاء کیلئے نامناسب سمجھنا غلط ہے۔

عید کا مصافحہ ومعانقہ:

اسلامی آداب ملاقات میں سلام کے ساتھ مصافحہ منقول ہے اور احادیث میں اس کی تاکید وترغیب آئی ہے۔ اسی طرح بوقت رخصت بھی مصافحہ کا ثبوت ملتا ہے۔ (۲)

مگر ہمارے یہاں اور دوسرے بعض علاقوں میں مخصوص نمازوں اور عید کی نماز کے بعد جو مصافحہ کا طریقہ رائج ہے، یہ احادیث وآثار صحابہ واقوال سلف سے ثابت نہیں ہے۔ مصافحہ بلاشبہ سنت وعبادت ہے، مگر اس کا موقعہ یا تو اول ملاقات ہے یا وقت رخصت، نمازوں کے بعد یا کسی اور تقریب کے موقعہ پر مصافحہ کرنا غیر مشروع ہے۔ لہٰذا عید کے موقعہ پر عید کا مصافحہ کرنا خلاف سنت ہے؛ بلکہ بدعت ہے۔ چنانچہ علماء نے مخصوص نمازوں کے بعد کے مصافحہ کو اسی وجہ سے سنت کے خلاف اور بدعت قرار دیا ہے کہ یہ اس کا موقعہ نہیں ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:

”قد يكون جماعة يتلاقون من غير مصافحة ويتصاحبون بالكلام وهذاكرة العلم وغيره مدة مديدة ثم اذا صلوا يتصافحون فاين هذا من السنة المشروعة ولهذا صرح بعض علماء نا بانها مكروهة وحينئذ انها من البدع المذمومة. (۳)

(۱) امداد الفتاوی: ۱/۶۰۲۔۶۰۳ (۲) قالہ الشیخ زکریاؒ فی حاشیتہ علی الکوکب الدری: ۲/۱۴۲

(۳) حاشیہ مشکوۃ: ۴۱

(کبھی کچھ لوگ بغیر مصافحہ کے ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں اور باتوں اور علمی مذاکرہ وغیرہ میں ایک لمبی مدت مشغول رہتے ہیں، پھر جب نماز پڑھ لیتے ہیں تو مصافحہ کرنے لگتے ہی، یہ سنت مشروعہ کہاں سے ہوا؟ اسی لئے ہمارے بعض علماء نے تصریح کی ہے کہ یہ مکروہ ہےاوراس وقت یہ مذموم بدعات میں سے ہے۔

ملاعلی قاریؒ کی یہ عبارت ہمارے یہاں کے عید کے مصافحہ پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے؛ کیونکہ یہاں ایسا ہی ہوتا ہے کہ باپ بیٹا اور دیگر گھر کے افراد اور دوسرے احباب مل کر گھر سے نکلتے ہیں اور عید گاہ پہنچتے ہیں، آپس میں ملاقاتیں، بات چیت سب کچھ ہوتاہ، جب عید کی نماز وخطبہ سے فارغ ہوتے ہیں تو یہی لوگ آپس میں مصافحہ کرتے ہیں، حالانکہ پہلے سے ملاقات ہے۔لہٰذا یہ بدعت مذموم ومکروہ ہے۔

حاصل یہ کہ مصافحہ کا موقعہ ملاقات کا اول وقت یا رخصت ہونے کا وقت ہے، عید کا کوئی مصافحہ اسلام میں نہیں ہے۔اسی طرح معانقہ (گلے ملنا) بھی بعض مواقع خاصہ میں جیسے سفر سے آنے کے وقت جائز بلکہ سنت ہے۔مگر عید کے موقعہ پر معانقہ کرنا بے اصل بات ہے جب کہ بعض ائمہ کے نزدیک معانقہ تو ویسے بھی سنت نہیں ہے، بلکہ امام اعظم ابوحنیفہؒ وامام محمدؒ کے نزدیک (ایک قول کے مطابق) مکروہ ہے۔ چنانچہ امام محمدؒ نے تصریح کی ہے کہ:

"ویکره ان یقبل الرجل فم الرجل ا و ید ه اوشیأمنه او یعانقه"(۱)

(مکروہ ہے کہ مرد مرد کا منہ یا ہاتھ یا کوئی اور عضو کا بوسہ لے یا معانقہ کرے)

یہ امام محمدؒ ابوحنیفہؒ کے تلامذہ میں سے ہیں اور الجامع الصغیر (جس کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے) میں امام ابوحنیفہ کا مسلک بیان کرتے ہیں اور چونکہ اس جگہ اپنا یا امام ابو یوسفؒ کا اس مسئلہ میں اختلاف نہیں بتایا ہے، اس لئے یہ گویا سب ائمہ احناف کا

(۱) الجامع الصغیر مع شرحہ النافع الکبیر: ۳۹۳

متفقہ مسئلہ ہوا۔ اگر چہ امام طحاویؒ نے امام ابو یوسف کا اختلاف بتایا ہے، مگر بعض علماء کی تحقیق میں اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ (۱)

اور یہ مکروہ ہونا بعض علماء کی تحقیق کے مطابق اس وقت ہے جبکہ شہوت کا خوف ہو اور بعض کے نزدیک ملاقات کے وقت مکروہ ہے۔ البتہ سفر سے آنے کے وقت یا غایت محبت واشتیاق کے وقت مکروہ نہیں۔ (۲)

غرض یہ کہ معانقہ اگر جائز وسنت ہے بھی، تو اس کا موقعہ جو ہم نے تجویز کر رکھا ہے کہ عید کے دن نماز کے بعد ہونا چاہئے ، یہ درست نہیں ہے، اس سے بھی احتراز کرنا چاہئے۔

عید کے دن نئے کپڑوں اور عمدہ کھانوں کا اہتمام:

عید اہل اسلام کی خوشی وفرحت، بشاشت ومسرت کا سب سے بڑا موقعہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں اچھے کپڑوں، عمدہ کھانوں اور زیب وزینت کا اہتمام کر لینا بلا شبہ جائز اور ایک درجہ میں مطلوب بھی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ قربانی کے دنوں بعض بچیاں یوم بعاث کے موقعہ کے اشعار خوشی ومسرت سے پڑھ رہیں تھیں، حضرت ابو بکرؓ نے ان کو ٹوکا، تو اللہ کے رسول انے جو وہیں چادر اوڑھے لیٹے ہوئے تھے، فرمایا کہ ان کو چھوڑ دو اور پڑھنے دو؛ کیونکہ یہ عید کے ایام ہیں۔ (۳)

فقہاء کرام نے بھی عید کے مستحبات میں زینت اور اچھے لباس کو شمار کیا ہے۔ (۴)

اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں تاریخ وسیر میں آیا ہے کہ وہ عید کے لئے اپنے سب سے اچھے کپڑے زیب تن کرتے تھے۔ (۵)

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے اعلاء السنن: ۴۲۳/۱۷....... ۴۲۷/۱۷ (۲) اعلاء السنن: ۴۲۳/۱۷
(۳) متفق علیہ مشکوۃ: ۱۲۶ (۴) البحر الرائق: ۱۵۸/۲ (۵) فتح الباری: ۴۳۹

خلاصہ یہ کہ عید کے دن خوشی وفرحت کا اظہار کرتے ہوئے گنجائش کے مطابق اچھے کپڑوں اور عمدہ کھانوں کا اہتمام کر لینا صحیح ودرست ہے۔ مگر یہ بات گوش ہوش سے سننے اور دیدۂ بصیرت سے ملاحظہ کرنے کی ہے کہ اسلام کی عید صرف کپڑوں اور کھانوں اور کھیل تماشوں کا نام نہیں ہے، کہ صرف انہی چیزوں میں اپنے دل ودماغ کے جوہر کو خرچ کر دیا جائے اور اپنی تمام تر کوششوں کا مرکز انہی باتوں کو بنالیا جائے۔

بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اکثر لوگ ان کھانوں اور کپڑوں کی فکر میں رمضان جیسے مبارک ماہ کی نور بار گھڑیوں کو خراب کرتے ہیں اور بعض رمضان کے شروع ہی سے اور بعض رمضان کے آخری ایام میں عبادت وطاعت کو چھوڑ کر تراویح اور دوسری نیکیوں کو خیرباد کہہ کر بازاروں میں عید کے کپڑوں، زیب وزینت کی چیزوں، جوتوں اور ٹوپیوں کے خریدنے کے لئے گھومتے پھرتے ہیں اور مزید افسوس یہ کہ ہماری مائیں اور بہنیں، پوری بے حیائی اور مجرمانہ بے پردگی کے ساتھ جاتی ہیں اور گھنٹوں گھنٹوں گھومتی پھرتی ہیں، کیا عید منانے کا یہ اہتمام جس سے رمضان کا بابرکت مہینہ اکارت چلا جائے، عبادات معطل ہو جائیں اور مزید یہ کہ گناہوں میں اشتغال ہو جائے، جائز قرار دیا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔

اسی طرح عید کے دن کھانوں کا ایسا اہتمام کہ عید محض ایک کھیل تماشا بن کر رہ جائے، کسی طرح گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ صحابہ میں سے حضرت عمرؓ کا کیا مقام ومرتبہ ہے؟ اس سے کون ناآشنا ہوگا۔ آپ عید کے دن عیدگاہ چلے جا رہے ہیں اور پیر میں جوتے تک نہیں تھے۔ (۱)

حضرت علیؓ نے عید الاضحیٰ (بقرعید) کے دن ایک دفعہ مہمان کے سامنے حلیم

(۱) منتخب کنز العمال بحوالہ حیاۃ الصحابہ: ۲/۶۶۲

(مختلف اناج ڈالکر ابالا ہوا کھانا) پیش کیا، تو مہمان نے عرض کیا کہ امیر المومنین! بہتر ہوتا کہ آج بطخ کھلاتے، اللہ نے تو مال کی زیادتی کر رکھی ہے۔ (۱)

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کبھی ایسا اہتمام عید کے لباس و کھانے کا نہیں فرماتے تھے، جیسے آج ہم میں رائج و عام ہو گیا ہے، بلکہ بر وقت جس قدر گنجائش ہوئی، اتنا اہتمام (حدود میں رہتے ہوئے) کرلیا کرتے تھے۔

یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ عید کے لیے علماء وفقہاء نے نئے کپڑوں کو مستحب نہیں قرار دیا ہے، بلکہ مستحب صرف اس کو قرار دیا ہے کہ اپنے کپڑوں میں سے سب سے اچھے وعمدہ کپڑے پہنے جائیں، اور لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نئے کپڑوں کے بغیر عید ہی نہیں ہوتی اور اس غلط رسم کی وجہ سے بعض لوگ قرض میں مبتلا ہوتے ہیں اور بعض تو سودی قرض لے کر نئے کپڑوں کا انتظار کرتے ہیں اور عید جیسی نعمت کو پا کر خدا کو ناراض کرتے ہیں۔ کس قدر افسوس ناک حالت ہے؟

پھر عید کے ان فضول اخراجات، عمدہ کھانوں، نئے کپڑوں، بہترین جوتوں، خوشنما ٹوپیوں، لڑکیوں کیلئے زیورات وغیرہ وغیرہ جن کی اقسام وانواع گنانے کی بھی ہمیں فرصت نہیں ہے، انکی خاطر رمضان کا پورا مہینہ لوگ مال جمع کرنے اور جس طرح بھی مل جائے بٹورنے میں لگے رہتے ہیں، کیا رمضان اسی لئے آتا ہے؟

یہ سب اس لیے کہ ہم نے عید کا مفہوم یہ سمجھا ہے کہ کھائیں پئیں، موج اڑائیں، زیب وزینت کر کے سیر وتفریح کرتے پھریں، مگر اچھی طرح یاد رکھو عید کا یہ مفہوم ممکن ہے کہ ہندوؤں کی لغت میں ہو۔ عیسائیوں کی زبان میں ہو، یہود بے بہبود کی اصطلاح میں ہو، مگر اسلام کی لغت واصطلاح میں دراصل خدا کی رحمت و برکت کے اوپر خوش ہونے اور اس خوشی میں شکر الٰہی بجالانے کا نام ہے۔ ہم اپنی اس کتاب

(۱) بدایہ بحوالہ حیاۃ الصحابہ: ۳۲۶/۲

کو بھی اور اس مضمون کو بھی حضرت امام العصر مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے ایک ملفوظ پر ختم کرتے ہیں جس میں عید کی حقیقت کو بیان فرمایا ہے، فرماتے ہیں:

''عید خوشی و مسرت کا نام ہے اور اہل دنیا کے نزدیک ہر قسم کا سرور وانبساط اور ہر طرح کی فرحت وابتہاج عید کے مترادف ہے، لیکن شریعت مقدسہ اور ملت بیضاء کی نظر میں عید اس خوشی و مسرت کو کہتے ہیں جو نعمائے ربانی (اللہ کی نعمتوں) اور کرمہائے الٰہی کے شکر اور اسکے فضل وجود پر ادائے نیاز کیلئے کی جاتی ہے، دنیا خود فانی ہے اور اس کے باغ و بہار فانی، پھر اس پر کیا مسرت وانبساط؟ عید کی حقیقت اصلیہ اس دائمی سرور میں مضمر ہے جس کی نسبت خود ذات احدیت سے وابستہ ہے۔ (۱)

دعاء ہے کہ اللہ تعالی اہل اسلام کو دین کی حقیقت سمجھنے اور رسومات غیر شرعیہ و بدعات وخرافات سے بچنے کی توفیق بخشے۔ آمین۔

ضمیمۂ مفیدہ

کتاب کی جب کتابت مکمل ہوگئی تو چند صفحے خالی رہ گئے، مناسب خیال کیا ان صفحات میں روزوں کی اغلاط کا تذکرہ جو حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے فرمایا ہے، یہاں ضمیمہ کی حیثیت سے نقل کر دیا جائے۔

روزے اور عید کی اغلاط:

(۱) مشہور ہے کہ ایک روزہ رکھنا اچھا نہیں، اس مشہور کی کوئی اصل نہیں۔

(۲) ایک اعتقاد یہ ہے کہ کسی کی افطاری سے روزہ نہ کھولو، سارا ثواب اسی کو ملجاوے گا، حالانکہ یہ غلط ہے، روزہ دار کو ثواب میں کوئی کمی نہیں آتی۔

(۳) یہ مشہور ہے کہ شب برات کے حلوہ سے اگر پہلا روزہ افطار کیا جاوے،

(۱) ملفوظات محدث کشمیریؒ: ۳۵۲ ملخصا

بہت ثواب ہے، یہ بالکل غلط ہے۔

(۴) روزہ کی نسبت تمسخر (مذاق) کے کلمات کہنا مثلاً یہ کہ روزہ وہ رکھے جس کے گھر میں اناج نہ ہو، یا یہ کہ ہم سے بھوکا نہیں مرا جاتا کفر ہے۔

(۵) اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عید کی شب میں روزہ ہوتا ہے اور صبح کو کہتے ہیں روزہ کھول لو، یہ بالکل بے اصل ہے۔

(۶) بعض عورتیں اپنی لڑکی کے نکاح کے دن روزہ رکھنا ضروری سمجھتی ہیں، یہ محض بے اصل ہے۔

(۷) بعض جگہ مشہور ہے کہ اگر کوئی شخص شش عید کے روزے رکھ لے تو سود کا گناہ ختم ہو جاتا ہے، یہ بیہودہ بات ہے، سود کا گناہ اس طرح ختم نہیں ہوتا۔

(۸) آج کل عام طور سے بچوں کو عید گاہ لیجانے کا عام رواج ہو گیا ہے جس کو دیکھو وہ اپنے ساتھ ایک دم چھلا ضرور لئے ہوتا ہے، یہ طریقہ صحیح نہیں۔

(۹) بعض جگہ عیدین کی امامت موروثی طریقے پر کرائی جاتی ہے، خواہ امامت میں اہلیت ہو یا نہ ہو، بعض جگہ تو امام قرآن بھی صحیح نہیں پڑھتا، ایسی صورت میں نماز ہی سب کی باطل ہو جاتی ہے۔

(۱۰) اکثر عوام خطبہ میں حضور ﷺ کا اسم مبارک سن کر بلند آواز سے درود شریف پڑھتے ہیں، یہ جائز نہیں۔ زبان سے درود شریف نہ پڑھے، ہاں دل ہی دل میں پڑھ لینے کا مضائقہ نہیں۔

(۱۱) عید، بقرعید اور جمعہ میں لوگ رسم جان کر مصافحہ کرتے ہیں یا گلے ملتے ہیں، یہ کہیں قرآن وحدیث میں ثابت نہیں۔ اس لیے یہ رسم بدعت ہے۔

(م،ع)

محمد شعیب اللہ خان مفتاحی
مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور